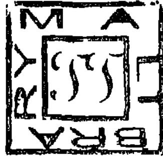
سلسلہ کلام اساتذۂ اردو

نمبر۳

انتخاب

مثنویاتِ میرؔ



مع تمہید و مقدمہ

مرتبۂ

آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان نائٹ ایم اے ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لا

جج ہائی کورٹ الہ آباد

(محمد احید الدین ایف آر ایس اے پرنٹر)

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

بار اول

سنہ ۱۹۳۰ء





فہرست تصحیح اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
مقدمہ ۹	۶	شبہ کیا۔ اب اٹھنے	"شبہ کیا" کے بعد ڈیش علامتِ ختم فقرہ سے قبل یہ اضافہ کرلیا جائے "میر کا خود شعر ہے [illegible] کیا چارہ کہتا ہے؟"
مقدمہ ۱۳	۶	زبان مکان	زمان و مکان
" ۱۴	۱۷	ثواب آصف الدولہ	نواب آصف الدولہ
" ۱۸	۱	اسنادی	اُستادی
" ۲۰	۱۴	ابہام بھی ہیں	ابہام بھی نہیں
" ۲۷	۱۶	ہمیں دُنیا سے	ہمیں دنیا سے
" ۲۸	۱۲	جو دربار کے لیے	جو قصائد کے لیے

اغلاط انتخاب مثنویات میر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۳	نیرنگب سازی	نیرنگ سازی
۷	۵	کہاں ہو تو	کہاںؔ ہو تو
۷	۹	ناز پرورو مہر...	ناز پرورِ...
۸	فٹ نوٹ ۲	۵۲ فائدہ لیا گیا۔ وجہ مفاد	۵۲ حاصل
۱۰	۱۹	کٹی بے وطن	کئی بے وطن
۱۱	۱۴	پلا ساقے	پلا ساقی
۱۵	۲۰	غمزۂ و خشم	غمزہ و خشم
۱۷	۱۵	بے جاں وہ	بے جانِ وہ
"	۱۷	در پے امتحاں	در پۓ امتحاں
۲۰	۶	منتغل	مشتغل
۲۱	۱	دریائے عسق	دریائے عشق
"	۵	جنوں	جنون
"	۸	زخم تر کے بیج	زخم تر کے بیچ
۲۲	۳	ایک	اک
"	۱۲	عشق یکتا	عشق یکتا
"	فٹ نوٹ ۲	۱ بمعنی یکتا	۲ بمعنی یکتا
۲۳	۱	دیکھتے ہیں کے	دیکھتے اس کے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴	۶	جان تمناکش	جاں تمناکش
۲۸	۹	نازوخوبی	نازِ خوبی
״	۱۰	تلطف	تلطّف
״	۱۱	ذخار	زخار
۳۱	۱۹	ایک آفت	اک آفت
۳۲	۵	خوں رواں	خون رواں
״	۱۶	خون باری سے	خوں باری سے
۳۳	۱۵	وردزباں	وردِ زباں
״	۱۸	ہرایک کا	ہراک کا
״	فٹ نوٹ ۲	سہ دل مرا سہ چاک چاک	سہ دل مرا سہ چاک سہ چاک
۳۷	۱۶	کبوترجوں سے	کبوترجوں سے
۳۹	۱۳	خرابے	خرابے
۴۰	۳	جنوں	جنوں
״	۱۰	گے خوش	گئے خوش
۵۱	۲	بیڑۂ پان کو	بیڑۂ پاں کو
״	۷	جنوں کا آسیب	جنون کا آسیب
״	۱۶	لپچلے	لچپلے
۵۳	۱۰	سری خبطی	سڑی خبطی
۵۶	۱۳	گوئی پاس	کوئی پاس
۶۱	۱۳	خواب کراں	خوابِ گراں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۲	۲۰	تو خوشی جی	تو خوش جی
۶۳	۲	جمن میں	چمن میں
״	۳	گل بداماں	گل بداماں
۶۴	۳	شکوں	شگوں
״	۸	خوبیٔ خرام	خوبیِ خرام
۶۶	۲	کیاب ہیئے	کباب رہیئے
״	۱۶	بے ہودہ	بیہودہ
۶۷	۲۲ فٹ نوٹ	سہ کوچ کا نقارہ بجتا	سہ کوچ کا نقارہ بجاتا ہو
۶۹	۱۳	سہ بیماری سے صحت	سہ بیماری سے صحت بحالی
۷۲	۷	نوئی	لوئی
״	۱۱	پردہ ہی گا	پردہ رہے گا
״	۱۸	ڈھیری	ڈھیری
۷۳	۳	ایوان	ایواں
۷۴	۱	بیچ کوئی	پیچ کوئی
״	۱	قند کروں	فند کروں
״	۷	بوریہ	بوریا
۷۵	۱۴	یاروں کا	یاروں کو
״	۲۰	درکا !	درکا
۷۷	۱	ایوان	ایواں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۸	۲	(۷۸)	(۱۳)
″	۲۰	ہے گئے ہیں	لے گئے ہیں
۸۰	۹	تجی لطمی	تُجّہ لطمی
۸۱	۵	طلاطم	تلاطم
۸۳	۴	یاددے	یاد دے
″	″	سرو دستوں کو	سرو دمستوں کو
″	۱۴	لعل ناب و گہر	لعل ناب و گہر
″	۱۸	پلٹن	پلٹنیں
۸۵	۳	خردو پیر	خورد و پیر
″	۲۰	عیاں	عیاں
″	۲۱ فٹ نوٹ	۱؎ بلند	۱؎ چرخ اثیر یعنی چرخ بلند
″	″	۳؎ دوم دار	۳؎ دُم دار
۸۷	۵	جہاں کہن	جہانِ کہن
″	۱۷	چنیں وچناں	چنین و چناں
۸۸	۲	جرم	خرّم
″	۱۱	ایک دو درم	اک دو دم
″	۱۹	شیر زیاں	شیر ژیاں
۹۲	۷	طلاطم	تلاطم
۹۳	۱۲	شیر غزیں	شیر عزیں
۹۴	۸	ارتب	ارنب
″	۹	الٹنی گئی	الٹی گئی
۹۵	۱۵	جبل سے بُلند	جبل سے بلند
۹۸	۷	جنسا	جیسا
″	۱۹	صدا	سدا
۱۰۱	۵	گزار ہوا	گزارا ہوا
۱۰۲	۸	سوئربن	سوربن
۱۰۳	۱۰	رونق پزیر	رونق پذیر
۱۰۷	۷	دھنے لگے	دھنسنے لگے
۱۰۹	۱۴	۲؎ غلاظت کے کیڑے	۲؎ گھورے، کوڑے کے کیڑے
۱۱۰	۹	پکس ہیں	پھبکیں ہیں
۱۱۴	۱۷	فائدہ	فارہ
۱۱۵	۲۰	گر	گر
۱۱۹	۱۵	جان	جاں
۱۲۱	۱۰	بنیہ	بنیا
″	۱۸	وہ منی دنگ	وہ منی دیک
″	۲۰	وہ بلاغ	جو وہ بلاغ
۱۲۳	۱۰	سجے	سمجھے
۱۲۵	۱۵	اٹھائے	اٹھائے
″	″	آئے	آرے
۱۲۸	۳	دُو	دو
۱۳۰	۶	جلدی مں	جلدی ہیں

تمہید

سبب انتخاب مقدمہ لکھنے سے پہلے تمہید کے طور پر میں سطور ذیل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے میر ایسے اُستاد کی مثنویات میں سے انتخاب کی جرأت کیوں ہوئی اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا ہے کہ میر نے وہ زمانہ پایا تھا جب کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے فحش مضامین یا الفاظ کا اشعار میں قلمبند ہو جانا کچھ بھی معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ بعض قصّے ایسے بھی نظم کیے ہیں جو موجودہ زمانہ میں مغربی خیالات کے اصحاب کی نگاہ میں سخت قابل اعتراض ہیں اُن فحش خیالات یا غیر فطری حکایات کو ان کی اصلی صورت میں شایع کرنا بالکل نازیبا ہے۔ اور غیر پاکیزہ تصوّرات کی اشاعت ہرگز شایاں نہیں یہ پڑھنے والے کے دل میں میر کی عظمت کو گھٹاتی اور اخلاق کے زینے سے ان کے کلام کو گرا دیتی ہے۔ لہٰذا یہ مناسب خیال کیا گیا کہ اکثر اشعار اس طرح پر چھوڑ دیئے جائیں کہ مثنوی کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جائے اور اصل قصّہ کی صورت بھی بدلی ہوئی معلوم نہ ہو۔ مگر یہ اُمید کرنا کہ اس کوشش میں پوری کامیابی حاصل ہوگی ممکن نہیں ہے۔

دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ میر کا کلام کثیر ہے ماشاء اللہ طویل عمر پائی تھی اور ہمیشہ نظم لکھتے رہے۔ اس لیئے کلام کا مجموعہ ضخیم ہو گیا مثنویات کا ذخیرہ بھی کافی طویل ہے۔ ان کی زندگی میں، غالب کے دیوان کی طرح سے ان کے کلام کا کوئی انتخاب نہیں ہوا۔ ہر قسم کے اشعار بھرے ہیں۔ بقول آزادؔ ان کے کلام میں رطب و یابس سب کچھ ہے آزردہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔ کہ

"پستیش بغایت پست و بلندیش بغایت بلند است"

چنانچہ مثنویات میں بھی ہر قسم کے اعلیٰ، ادنیٰ اشعار موجود ہیں۔ اس لیئے انتخاب ناموزوں نہ تھا۔ اصول انتخاب یہ رکھا گیا ہے کہ صرف اُن اشعار کو نقل کیا ہے جو فن شاعری کے نقطۂ نظر سے

قابلِ قدر ہیں جو محض بھرتی کے اور پھیکے اشعار تھے انھیں نکال دیا گیا ہے۔ فحش اشعار بھی ترک کر دیئے گئے ہیں۔ افسوس کہ ایسی صورت میں دو یا تین مثنویوں کے سوا، دیگر مثنویات کے پورے قصے پیش نہ کیے جا سکے مگر چونکہ اصلی غرض، عمدہ کلام کے شایع کرنے کی تھی نہ کہ صرف کہانیاں اور وہ بھی خصوصاً ایسی کہانیاں جن سے کوئی اچھا اخلاقی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس لیے اس خامی کو گوارا کیا گیا۔

معذرت

چونکہ اکثر مصنفین نے میر کے حالات پر بہت کچھ لکھا ہے اور نکتہ چینی کی ہے۔ اس لیے اب اس کا موقع نہیں رہا کہ کوئی نئی بات پیدا کی جائے۔ صرف میر کے والد کا نام محمد علی ہونا اور میر کی پیدائش کا اصلی سال سنہ ۱۱۳۶ھ ہونا، اور مطبوعہ نسخہ ذکر میر میں بہت کچھ تاریخی حالات کا ہونا، جو کہ میر کے آخری حالات زندگی اور آخر قطعہ تاریخ کے کئی سال بعد درج کیے گئے ہیں اور اب تک کسی مطبوعہ کتاب میں نظر سے نہیں گزرے، ان باتوں کے علاوہ کسی خاص نئی بات کے دریافت کرنے کے دعوے کی جرأت نہیں کی گئی ہے۔ کلیات میں سے چند نئے اشعار کا تلاش کر لینا، جن سے میر کے مزاج کا اندازہ ہو سکے یا ان کی زندگی کے کسی پہلو پر روشنی پڑے نئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور نہ صرف معلوم باتوں کو دوسری ترتیب یا دوسرے الفاظ میں ادا کرنا کوئی غیر معمولی امر ہے۔

البتہ آج کل چونکہ یہ رواج ہو چلا ہے کہ مولانا آزاد کے اکثر منقولات پر اعتراض کیا جائے ان کو غلط بتایا جائے اور ان پر یہ الزام لگایا جائے کہ اُنھوں نے من گڑھت قصے درج کیے ہیں اور ان پر اکثر مواقع میں نہ صرف مبالغہ بلکہ افترا پردازی کی تہمت بھی لگائی گئی ہے۔ تاکہ میر جیسے بڑے اُستاد کو خلیق منکسر المزاج ثابت کیا جائے۔ کیونکہ یہ باتیں ایک بڑے مسلم الثبوت اُستاد شاعر کے خلاف ہوتی ہیں حالانکہ بڑے سے بڑے اُستاد کے حالات کے متعلق بھی انصاف شرط ہے۔

اس لیے میں نے یہ ضرور کوشش کی ہے کہ ان الزامات کو از سرِ نو جانچوں اور اگر بے جا ہوں تو دور کروں۔

جو احسانات آزاد نے تاریخ ادب اُردو پر کیے ہیں ان سے زبان اُردو کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اور محض یہ وجہ کہ کچھ باتیں جو اُنھوں نے لکھی ہیں وہ ایک مسلم الثبوت بڑے شاعر کے خلاف ہوتی ہیں۔ ان کو غلط یا بے بنیاد قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آزاد نے اپنی رنگین بیانی سے قصوں میں نمک مرچ لگایا ہے لیکن ان سے

اکثر باتوں کو بے بنیاد کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیئے آزاد پر جو بے جا حملے کیئے گئے ہیں، اس دیباچے میں ان کے رفع کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہی اور جا بجا حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

اعتراف مجھے خود اعتراف ہی کہ اس دیباچہ میں کسی جدت یا نئی بات کے دریافت کرنے کا دعویٰ نہیں کیا گیا ہی۔ مشہور و معروف باتوں کا دوسرے الفاظ میں، نئی ترتیب سے اظہار کیا گیا ہی۔ اور جہاں کہیں کسی سابق نکتہ چین سے اختلاف کی جرأت کی گئی ہی، اسی موقع پر اس گستاخی کا اعتراف بھی کر لیا گیا ہی چونکہ تاریخی واقعات یا تنقیدی رائے کا ہر موقع پر حوالہ دینا ناممکن تھا اس لیئے یہ فروگذاشت قابل نظراندازی ہی۔

واقعات کے زیادہ حصے مولانا آزاد کی بیش بہا کتاب آب حیات سے ماخوذ ہیں۔ جس کا پورا اقرار کیا جاتا ہی۔ اکثر مضامین دیگر تصانیف پر مبنی ہیں، جس کی تفصیل ہر مقام پر امکان سے باہر تھی اس لیئے ان کتابوں کی مختصر فہرست درج کی جاتی ہی۔ چونکہ حال کی کتابوں کے اکثر واقعات آب حیات سے ماخوذ ہیں۔ اس لیئے ان کے مکرر اعتراف کی چنداں ضرورت نہ رہی

فہرست تصانیف

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
۱	آب حیات	محمد حسین آزاد (طبع اول)
۲	ذکر میر	میر تقی مع مقدمہ مولوی عبدالحق
۳	نکات الشعراء	میر تقی مع دیباچہ نوشتہ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
۴	تذکرہ شعرائے اُردو	میر حسن دہلوی
۵	گلشن ہند	میرزا علی لطف
۶	مخزن نکات	قیام الدین قائم چاندپوری
۷	سخن شعراء	عبدالغفور خاں نسّاخ
۸	تذکرہ شمیم سخن	مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی
۹	گلشن بیخار	محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
۱۰	سراپا سخن	سید محسن علی محسن
۱۱	چمنستان شعرا	رائے لچھمی نراین شفیق
۱۲	تذکرہ مراۃ الخیال	اصل کتاب دستیاب نہ ہوسکی۔
۱۳	گل رعنا	مولوی عبدالحیٰ (ناظم ندوۃ العلما)
۱۴	شعرالہند	مولوی عبدالسلام ندوی
۱۵	انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق
۱۶	تاریخ ادب اردو[1]	مرزا محمد عسکری
۱۷	گلزار سخن	جگناتھ پرشاد فیض
۱۸	مقدمہ دیوان حالی	مولانا الطاف حسین حالی
۱۹	نیرنگ خیال	میر نمبر رسالہ نیرنگ خیال
۲۰	گلزار ابراہیمی	
۲۱	تذکرہ شورش	یہ کتابیں دستیاب نہ ہوسکیں
۲۲	بہار بے خزاں	
۲۳	تذکرۃ الخواتین	مولوی عبدالباری

ل تاریخ ادب اردو بابو رام سکسینہ کی کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر کا اردو ترجمہ ہے جو مرزا محمد عسکری صاحب نے کیا ہے
لیکن میر کے حالات کے متعلق اصل متن سے ترجمہ میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ اسی لیے ترجمہ کا حوالہ دیا گیا۔

مقدمہ

تاریخی حالات

خاندان وولادت میر محمد تقی میر کی پیدایش اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی۔ بقول آزاد[1] ان کے والد کا نام میر عبداللہ تھا۔ گلزارِ ابراہیمی میں بھی میر عبداللہ ہی لکھا ہے۔ لیکن کسی اور قدیم تذکرہ میں اس نام کا پتہ نہیں چلتا۔ مولوی عبدالحق[2] کے خیال میں اصلی نام علی متقی تھا۔ لیکن میری رائے میں اُن کا اصلی نام محمد علی تھا اور پرہیزگار درویش ہونے کی وجہ سے اُن کا لقب علی متقی ہوا۔ میں اس کے ثبوت میں ذکرِ میر کی دو عبارتوں پر استدلال کرتا ہوں جو نظرانداز کی گئی ہیں۔ صفحہ ۶۲ پر یہ درج ہے کہ جب خواجہ محمد باسط میر کو نواب امیرالامرا کی خدمت میں لے گئے اور نواب نے پوچھا کہ "ایں پسر از کیست؟ خواجہ نے جواب دیا کہ "از میر محمد علی است"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کا اصلی نام محمد علی تھا۔ اسی طرح سے صفحہ ۵ پر میر نے اپنے والد کے متعلق تحریر کیا ہے کہ "جوان صالح عاشق پیشہ بود۔ دل گرمی داشت بخطاب علی متقی امتیاز یافت"۔ اس سے واضح ہے کہ علی متقی اُن کا لقب یا عرف تھا ذکرِ میر میں اُن کو اکثر لفظ "درویش" سے یاد کیا ہے۔ سید امان اللہ مرید خاص کے انتقال کے بعد سے اُن کے والد اپنے کو عزیز مردہ کہلوانے لگے۔ ذکرِ میر میں کسی مقام پر ان کے والد کو میر عبداللہ نہیں کہا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانہ میں میر کے والد کے نام کے متعلق لوگوں کو غلط فہمی تھی۔ عرصہ کے بعد ایسی غلطی کا ہونا تعجب خیز نہیں ہے۔

میر حسن[3] دہلوی نے میر کو برادر زادۂ سراج الدین خان آرزو لکھا ہے اور میر علی لطف[4] نے صرف یہ لکھا ہے کہ وہ خان آرزو کے دور کے رشتہ داروں میں تھے۔ آزاد نے ان کو میر کے چھوٹے سوتیلے

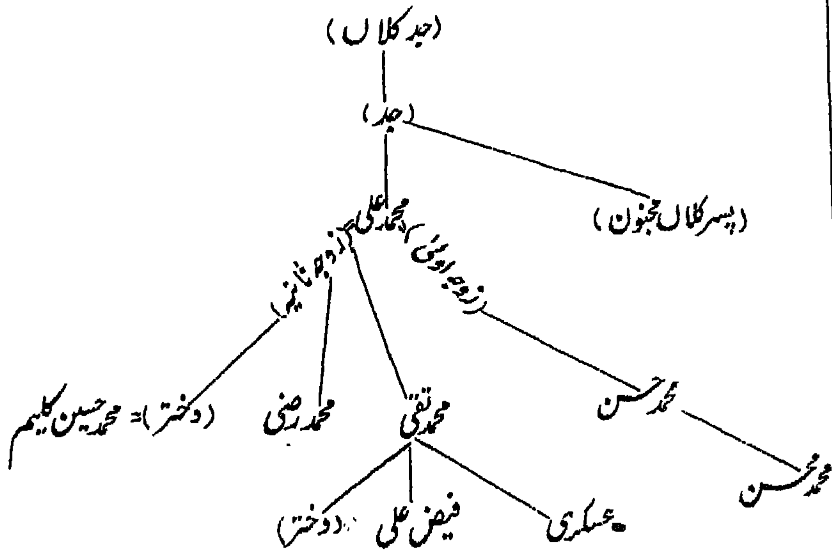
---

[1] آب حیات صفحہ ۲۰۵ [2] مقدمہ ذکرِ میر صفحہ [3] تذکرہ شعرائے اُردو صفحہ ۱۶۵ [4] گلشن ہند صفحہ ۱۵۲۔

بھائی کا خالو ہونا بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالحی[۵۱] نے بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ ذکر میر سے اب صاف طور پر ظاہر ہے کہ خان آرزو میر کے بڑے بھائی کے خالو تھے جو یقیناً سوتیلے بھائی تھے یعنی خان آرزو کی ہمشیرہ میر کی سوتیلی ماں تھیں۔ میر کی بہن میر محمد حسین کلیم دہلوی سے منسوب تھیں۔ اس رشتہ کا میر نے نکات الشعرا[۵۲] میں قرابت قریبہ سے اظہار کیا ہے۔

میر کے بڑے بھائی کا نام محمد حسن تھا اور وہ حافظ تھے۔ اُن کے لڑکے محمد محسن[۵۳] تھے۔ چھوٹے بھائی کا نام محمد رضی تھا۔ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ میر کی پیدایش اُن کی بہن کی شادی کے بعد ہوئی اور چونکہ داماد کا نام محمد حسین تھا اس لیے میر کے والد نے کسی لڑکے کا نام محمد حسین نہ رکھا۔ میر[۵۴] کے بڑے بیٹے میر عسکری عرف میر کلو عرش اور چھوٹے بیٹے میر فیض علی فیض تھے۔ ایک بیٹی بھی تھیں جن کا تخلص بیگم تھا

شجرہ خاندان حسب ذیل ہے



ذکر میر[۵۵] سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کے بزرگ مع اپنے قبیلے کے حجاز سے آکر سب سے پہلے دکن میں وارد ہوئے۔ وہاں سے احمد آباد گجرات میں مقیم ہوئے۔ ان کے پردادا احمد آباد گجرات سے اکبر آباد آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ میر کے دادا، اکبر آباد میں فوج دار مقرر ہوئے اور

۵۱ گل رعنا ص۱۵۱ ۵۲ نکات الشعرا ص۹۵ ۵۳ نکات الشعرا ص۱۴۸ ۵۴ مقدمہ فیض میر ص۷ ۵۵ ذکر میر ص۳

پچاس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کو خلل دماغ تھا اس کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ اور ان کے چھوٹے لڑکے میر کے والد تھے۔

سیادت ان کے نسب کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ یہ شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ اپنے کو سید کہتے تھے لیکن ان کے زمانے میں کچھ لوگ اس دعوے پر حرف زن تھے۔ تذکرۂ شورش میں ہے کہ خطاب سیادت ان کو شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا۔ اور آب حیات میں آزاد نے یہ لکھا ہے کہ چند کہن سال بزرگوں سے انھوں نے سنا تھا کہ میر کے والد نے اُن کو متنبہ کیا تھا کہ میر تخلص کرنے سے سید بنجاؤ گے سودا کا ایک شعر آزاد نے نقل کیا ہے جو کلیات میں نہیں پایا جاتا اور وہ میر کے شرافت کی ہجو میں ہے۔

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کرکے میر
کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

سودا کا ایک دوسرا شعر جو مشہور ہے اور جس میں میر ہی کے خاندان کی طرف اشارہ ہے یہ ہے۔

میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد
بٹیا تو گندنا پینے اور آپ کو تہ میر[1]

بلا کسی شہرت یا بنیاد کے ذات پر حملہ کرنا ایک تعجب خیز بات تھی۔ زمانۂ حال کے تمام نکتہ چین آزاد کے اس شبہ کرنے پر مضحکہ کرتے ہیں۔ اور دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ میر ہمیشہ اپنے کو سید کہتے تھے اور ذکر میر میں بھی اپنے کو میر لکھا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا لقب میر مشہور رہا۔ لکھنؤ میں انکو سب سید یقین کرتے تھے اور خود میر نے اپنے کو برابر سید لکھا۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

لیکن مطبوعہ ذکر میر میں بھی میر نے اپنے کو سوائے میر تقی علی لکھنے کے صاف طور پر سید ہونے کا

---

[1] مصالح یعنی مسالے۔ گندنا ایک قسم کا سبزہ خوردنی جو لہسن سے مشابہ ہے۔ کو تہ میر مراد دھنیا۔ کشنیز سبز

دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اپنے دادا یا پردادا کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ اپنے والد کو بھی سید نہیں لکھا ہے۔ اور نہ اپنے بھائیوں میں سے کسی کو میر یا سید کے لقب سے یاد کیا ہے۔ بخلاف اس کے غیروں کو مثلاً امان اللہ، مکمل خاں اور سعادت علی خاں کو سید لکھا ہے۔ البتہ مولوی مسعود حسن رضوی کے نسخہ میں "حقیقتِ حالِ مصنف" کے زیرِ عنوان اپنے متعلق یہ لکھا ہے کہ "کسے فقیر و سید و شاعر و متوکل دانستہ بطریقِ نذر چیزے می فرستید" مولوی عبدالحق[1] نے اپنے مقدمہ میں یہ لکھا ہے کہ میر صاحب نے ذکرِ میر میں ہر مقام پر اپنے والد کے نام کے ساتھ میر کا لفظ لکھا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے[2] کہ میر صاحب اپنے والد کو ہر جگہ میر علی متقی لکھتے ہیں۔ اسی سے مولوی محمد عسکری[3] نے بھی نقل کیا ہے لیکن ایسا لکھنا نہایت تعجب خیز ہے کیونکہ ذکرِ میر میں برابر اپنے والد کو علی متقی یا درویش یا عزیز مردہ کہہ کر حوالہ دیا گیا ہے کسی جگہ پر میر علی متقی مجھے نہیں ملا۔ صرف[4] ایک جگہ میر محمد علی درج ہے حقیقت میں جب علی متقی ان کا صرف لقب تھا تو اس کے پہلے میر لکھنا ہرگز موزوں نہ ہوتا۔ نہ کوئی درویش صفت بزرگ خود اپنے کو ایسا کہلانا پسند کرتا البتہ مضامین کے عنوان جو چھپے ہیں ان میں میر متقی علی لکھا ہے۔ مگر مولوی عبدالحق[5] نے اپنے مقدمہ میں خود تسلیم کیا ہے کہ یہ عنوان اصل میں موجود نہیں ہیں اور وہ خود ان کے اضافہ کئے ہوئے ہیں۔ مولوی مسعود رضوی کے نسخہ میں بھی اس قسم کے عنوان موجود نہیں ہیں اور نہ مولوی محمد شفیع کے نسخہ میں ہیں۔

دوسرا دعوے دونوں صاحبوں[6] نے یہ کیا ہے کہ اس کتاب میں میر نے اپنے والد کی زبانی اپنا نام میر محمد تقی لکھا ہے۔ اوّل تو ان کے والد کی زبانی اس طرح پر خطاب کیا جانا مجھے نہیں ملا۔ دوم یہ کہ اگر ہو بھی تو یہ تعجب خیز بات ہوگی کہ ایک صوفی منش درویش اپنے دس سال کے بیٹے کو میر محمد تقی کہہ کر پکارے۔ یہ صحیح ہے کہ میر نے اپنے کو اور دوسروں کی زبانی بھی میر محمد تقی لکھا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ کتاب انھوں نے ساٹھ سال کی عمر میں لکھی تھی جب وہ خود میر مشہور تھے۔ نہ تو وہ اقوال جو انھوں نے اپنے والد یا سید امان اللہ کے نقل کئے ہیں لفظ بہ لفظ اصلی ہو سکتے ہیں نہ اس کی امید کی جا سکتی ہے کہ دس سال کی عمر میں جو کچھ انھوں نے کانوں سے سنا اسے بجنسہ بعد کو قلمبند کیا۔ جب تخلص میر تھا

۱؎ مقدمہ ذکرِ میر ص۲ ۲؎ مقدمہ ذکرِ میر ص۷ ۳؎ تاریخ ادب اردو ص۱۶۹ ۴؎ ذکرِ میر ص۱۲ ۵؎ مقدمہ ذکرِ میر ص۸ ۶؎ مقدمہ ذکرِ میر ص۸ تاریخ ادب اردو ص۱۶۹

تو میر صاحب مشہور ہو جانا مشکل نہ تھا۔ اور اگر حقیقت میں وہ سید نہ تھے اور سید بن بیٹھے تو ذکر میر میں اپنے کو میر لکھنا بھی کوئی غیر قابل قیاس بات نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر ذکر میر میں جیسا لکھا ہے صحیح ہے کہ میر دس سال کے تھے جب ان کے والد نے انتقال کیا تو یہ قصہ کہ اُن کے والد نے ان کو متنبہ کیا تھا کہ میر تخلص کرنے سے سید بن جائیں گے ناقابل یقین ہوگا۔ تحقیق صرف یہاں تک ہے کہ میر اپنے کو سید ضرور کہتے تھے اور سید مشہور رہتے۔ اسی کے ساتھ ان کی زندگی ہی میں کچھ لوگوں نے ہجو میں ان کی سیادت پر شبہ کیا۔ اب اتنے زمانے کے بعد فیصلہ کرنا کہ درحقیقت میر سید تھے یا جیسا اکثر لوگوں نے اس زمانے میں کہا، سید بن بیٹھے تھے۔ مشکل ہے۔

سال پیدایش میر کی عمر اور ان کی پیدایش کے سنہ میں بہت کچھ اختلاف رائے رہا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔ سنہ وفات متعین ہے لیکن ولادت کے زمانے کی تحقیق اس درجہ تک نہ تھی۔ ذکر میر کے شایع ہو جانے سے اس بحث پر ایک نئی روشنی پڑی ہے۔ جو نسخہ خان بہادر مولوی شیرالدین صاحب سے مولوی عبدالحق کو ملا۔ اس میں تاریخی حالات درج کرنے کے بعد زمانے کی حالت پر میر نے تاسف ظاہر کیا ہے اور پھر اپنی ضعیفی، بیماری اور معذوری ظاہر کرتے ہوئے اپنی عمر کو ساٹھ سال بتلایا ہے۔ اس کے بعد کچھ لطائف نقل کیے ہیں اور آخر میں یہ قطعۂ تاریخ ہے۔

مسمّیٰ باسمی شد ای باہنر کہ ایں نسخہ گردد بہ عالم سمر
ز تاریخ آگہ شوی بے گماں فزائے عدد بست و ہفت ار بداں

چنانچہ جیسا مولوی عبدالحق نے حساب لگایا ہے ذکر میر کے ۱۱۷۰ عدد ہوتے ہیں اور اس میں ۲۷[1] اضافہ کرنے سے ۱۱۹۷ھ ہوتے ہیں جو کتاب کا تاریخی سال ہوگا۔ اس میں سے اگر ۶۰ منہا کر دیئے جائیں تو سال پیدایش ۱۱۳۷ھ ہوتا ہے۔ اسی کو مولوی عسکری[2] اور مرزا جعفر علی خاں اثر[3] نے بجنسہٖ نقل کر لیا ہے۔ جو بڑی دقت اس نسخہ سے پیدا ہوتی تھی اس پر اب تک لحاظ نہیں کیا گیا۔ جو تاریخی واقعات درج ہیں ان میں سے اکثر سنہ ۱۱۹۰ھ کے بہت بعد کے ہیں۔ سنہ ۱۱۹۶ھ سنہ ۱۷۸۲ء کے مطابق ہوتا ہے۔ گورنر جنرل وارن ہسٹنگس کا لکھنؤ آنا سنہ ۱۷۸۴ء میں ہوا۔ غلام قادر خاں روہیلہ نے شاہ عالم بادشاہ کی آنکھیں ۱۰ اگست سنہ ۱۷۸۸ء میں

[1] مقدمہ ذکر میر ص ف [2] تاریخ ادب اردو ص ۱۷۶ [3] نیرنگ میر نمبر ص ۲۷

نکالی تھیں اور پھر غلام قادر خاں کا مرہٹوں کے ہاتھ میں گرفتار ہونا اور راستہ میں اُن کا قتل کیا جانا ۴ مارچ ۱۷۸۹ء کا واقعہ ہے جو ۱۲۰۳ھ کے مطابق ہوتا ہے اس لیئے یہ یقینی بات ہے کہ قطعہ تاریخ جو لطیفوں کے بعد اس نسخہ میں درج ہے وہ اس نسخہ کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس نسخہ کا ہے جس میں یہ بعد کے تاریخی واقعات درج نہ تھے۔ اس پیچیدگی کے حل کرنے کے لیئے ایک اور قلمی نسخہ نے میری مدد کی۔ مولوی مسعود حسن صاحب رضوی لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی نے مہربانی فرما کر اپنا نسخہ ذکر میر ایک روز کے لیئے مجھے عنایت فرمایا جن کا میں نہایت ممنون ہوں یہ نسخہ اس نسخہ کے مشابہ ہے جو پروفیسر محمد شفیع وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے مولوی عبدالحق کو مقابلے کے لیئے دیا تھا مولوی مسعود حسن رضوی اور پروفیسر محمد شفیع کے نسخے میں تاریخی واقعات اس مصرع پر ختم ہوتے ہیں۔

"این شامت اعمال قیامت بسر آورد"

یہ مصرع مطبوعہ[1] نسخہ کے صفحہ ۱۲۰ پر ہے۔ اس کے بعد حقیقت حال مصنف کے سلسلہ میں چند مزید سطور کے بعد قریب قریب وہی عبارت درج ہے جو عبرت و خاتمہ کے عنوان سے مطبوعہ[2] نسخہ میں موجود ہے۔ بڑا فرق یہ ہے کہ بجائے ساٹھ سال کے عمر پچاس سال درج ہے عبارت یوں ہے "پیری رسید یعنی عمر بہ پنجاہ کشید" بعد کو لطائف ہیں اور پھر اخیر میں قطعہ تاریخ ہے جس کا آخر مصرع یہ ہے۔

فزائے دہ و شش عدد گر بران

آخر میں نسخہ ذکر میر کے اختتام پر شکر اللہ تعالیٰ ہے۔

اگر ذکر میر کے ۱۱۷۰ عدد میں ۱۶ کا اضافہ کیا جائے تو ۱۱۸۶ھ ہوتا ہے اور اس میں سے ۵۰ منہا کرنے سے ۱۱۳۶ھ سال پیدائش نکلتا ہے جو زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ان دونوں نسخوں پر تاریخی حیثیت سے وہ اعتراض نہیں عائد ہوتا جو مطبوعہ نسخہ پر ہے۔ کیونکہ جو آخری واقعہ حسام الدین خاں کے تنزل کا تحریر ہے وہ ۵ رجون ۱۷۷۲ء مطابق ۳ ار ربیع الاول ۱۱۸۶ھ کا ہے۔ قطعہ تاریخ چند ماہ پہلے کا ہے جب اُن کی عمر پچاس سال کی تھی اس کے بعد جو تاریخی واقعات مولوی بشیرالدین کے نسخہ میں زائد ہیں اُن میں سب سے پہلے نجف خاں کا جاٹوں پر حملہ کرنا درج ہے جو ۱۴ ر شعبان ۱۱۸۶ھ مطابق ۳۱ راکتوبر ۱۷۷۲ء کا ہے۔

---

[1] ذکر میر صفحہ ۱۲۰ [2] ذکر میر صفحہ ۱۵۱ و صفحہ ۱۵۳

اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ میر نے پہلا نسخہ ذکر میر کا اوائل ۱۱۸۰ھ میں ختم کیا اور قطعہ تاریخ کچھ پہلے لکھا۔ اس کے بعد کچھ واقعات اور اضافہ کیئے۔ جو اس وقت تک کے تھے جب وہ دلی میں رہے۔ دلی سے لکھنؤ کی روانگی پر یعنی ۱۱۹۰ھ میں تاریخی قطعہ کا آخری مصرع بدل دیا اور اپنی عمر ساٹھ سال درج کر دی۔ یہی عبارت اور یہی قطعہ مطبوعہ نسخہ میں ہے۔ لیکن اس تبدیلی کے بعد بھی تاریخی واقعات کا اضافہ کرتے رہے اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا یعنی ۱۱۹۲ھ تک۔ مگر ان کو اپنی عمر اور تاریخی قطعہ کے ترمیم کی نوبت نہیں آئی۔

تعلیم و مذہب ذکر میر میں حمد و نعت کے بعد سبب تالیف بیان کر کے اپنے بزرگوں کے ہندوستان آنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اور پھر اپنے والد کا ذکر کیا ہے۔ جو واقعات میر نے اپنے والد ماجد کے تحریر کیئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ علی متقی درویش اور صوفی مشرب تھے۔ اُنھوں نے علم معنوی میں شاہ کلیم اللہ سے جو اکبر آباد کے کامل اور تہجد گزار بزرگ تھے۔ اور اولیاء میں سے شمار کیئے جاتے تھے تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک نوجوان سید امان اللہ ان کے معتقد ہو گئے اور ان کے ساتھ رہنے لگے جن کو میر عم بزرگوار کہتے تھے۔ درویش متقی علی کی نصیحتوں اور سید امان اللہ کی تربیت کا اثر میر پہ ابتدا میں پڑا اور تصوف کی تلقین کا اثر ہمیشہ باقی رہا۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں　　اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

دیگر

لایا ہے میر شوق مجھے پردہ سے باہر　　میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

اس زمانہ میں اکثر صوفیوں سے صحبت رہی۔ لیکن ان دونوں کا انتقال جب میر کی دس ہی سال کی عمر تھی ہو گیا۔ ممکن ہے کہ میر نے اس زمانہ میں اپنی عمر کے تخمینہ کرنے میں غلطی کی ہو۔ جو واقعات لکھے ہیں وہ دس سال کے بچے کے لیئے موزوں نہیں معلوم ہوتے۔ باوجود اس صغر سنی کے میر کو وہ نصائح اور پند یاد تھے جن کو اُنھوں نے اپنے تذکرہ میں مفصل نقل کیا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد کا ایک اور تعجب خیز واقعہ درج کیا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کی عمر صرف دس سال کی تھی۔ ان کے بڑے بھائی علحدہ ہو گئے اور قرضخواہوں نے میر کا دامن پکڑا۔ بالآخر سید امان اللہ کے ایک مرید نے مدد کی اور قرض ادا ہو جانے کے بعد نعش دفن ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد میر دلی چلے گئے اور سراج الدین علی

آرزو کے ساتھ رہنے لگے اپنے والد کے انتقال کے بعد عنفوان شباب میں جب میر اکبرآباد سے دلی چلے گئے تو پہلے اپنے سوتیلے ماموں کے ساتھ رہنے لگے۔ یہ زمانہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کا تھا۔ دلی ہی میں پرورش اور تعلیم پائی۔ فارسی ادب میں کمال حاصل کیا۔ لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ عربی کی استعداد کس قدر تھی؟ خان آرزو کے شاگرد تھے۔ اپنے عہد شباب کی تالیف نکات الشعرا[۵۱] میں اپنے متعلق میر نے لکھا ہے کہ

"فقیر حقیر میر محمد تقی میر متوطن اکبرآباد است، بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد (دہلی) است"

نکات الشعرا میں میر نے خان آرزو کو اپنا استاد و پیر مرشد تسلیم کیا ہے میر حسن[۵۲] نے بھی میر کو آرزو کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن ذکر میر میں خان آرزو سے کسی قسم کی تحصیل علم کا اعتراف نہیں کیا ہے اور اپنے سوتیلے بھائی کے اشارہ پر اُن کی بے رُخی و بدسلوکی کا اظہار کیا ہے۔ ذکر میر سے صحیح وجہ اس بے اعتنائی کی نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ بہار بے خزاں سے مولوی عبد السلام[۵۳] نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اپنے شہر میں، عزیزوں میں سے ایک سے میر کو عشق پیدا ہوگیا اور رُسوائی کے خوف سے اکبرآباد چھوڑ دیا عمر بھر اس کی حسرت باقی رہی۔

میر نے، ذکر میر میں، میر جعفر دہلوی سے اپنی تعلیم حاصل کرنا تسلیم کیا ہے۔ اور ریختہ میں سید سعادت علی سے جو امروہہ کے رہنے والے تھے۔ اس کے بعد ہی اپنے خالو کی تلخ کلامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور مکان چھوڑ کر باہر چلے گئے اور بالآخر رعایت خاں کے ساتھ رہنے لگے۔

آزاد[۵۴] کی رائے میں چونکہ خان آرزو حنفی مذہب تھے اور میر شیعہ اور نازک مزاج اسی وجہ سے کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہوگئے۔ مولوی عبد الحیٔ[۵۵] نے اس واقعہ کو باور کرنا مشکل خیال کیا ہے۔ اور مولوی عبد الحق[۵۶] نے بھی یقین نہیں کیا ہے۔ کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ اس خیال کو بالضرور غلط قرار دیا جائے۔ ابتدا میں میر کی تربیت و پرورش صوفیوں میں ہوئی۔ اس سے قیاس

---

۵۱ نکات الشعرا، ص ۱۲۶ ۵۲ تذکرۂ شعرائے اُردو، ص ۱۵۱ ۵۳ شعر الہند، ص ۵۵ ۵۴ آب حیات ص ۲۰۳ ۵۵ گل رعنا ص ۱۵۱
۵۶ مقدمہ ذکر میر ص ۳

کیا جا سکتا ہو کہ ان کے خاندان کے لوگ حنفی مذہب تھے۔ اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کم سے کم زمانہ عروج شاعری میں ان کا مذہب، اہل تشیعہ کا تھا۔ منقبت کے قصیدوں کے چند مصرعے اس کو ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً

مسکنِ علی نگر ہی مرا ہیں علی پرست پیغمبر اس جگہ کا علی ہی خدا علی
"یعنی کہ ذات پاک ہو اس کی خدا کی ذات"
ایک شب نبی جو نکلے زبان مکان سے ذات مبارک آئی نظر اور شان سے
تھا بزم لامکاں میں بھی رونق فزا علی
ایک مولیٰ کہے ہیں ایک خدا کہتے ہیں یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
"قالب خاکی کے پردے میں خدا تو ہی تھا"
تیرے پردے میں حق ہوا موجود جانتے ہیں تجھی کو سب معبود

مگر چونکہ میر ایک فطری شاعر تھے فن شاعری میں محو تھے۔ اسی کی دھن تھی روشن خیال تھے۔ ان کے ابتدائی زمانہ کے کلام سے تصوف کی تعلیم و تلقین ٹپکتی ہو۔ فیض میر کی حکایتوں سے فقیروں اور درویشوں سے عقیدت معلوم ہوتی ہو۔ ان میں کسی قسم کا مذہبی تعصب نہ تھا۔ اور نہ انھوں نے کسی مقام پر اس شکر رنجی کی یہ وجہ بیان کی ہو۔ گو نازک مزاج تھے۔ اس لیئے اختلاف مذہب کو نفاق کی اصلی وجہ یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ میر نے فارسی زبان میں بہت بڑی استعداد حاصل کی۔ چونکہ اُس زمانے میں فارسی، عدالت کی زبان تھی، اس لیئے یہ کچھ غیر معمولی بات نہ تھی۔ دلی کی بود و باش کی وجہ سے، ان کا زباں داں ہونے کا دعویٰ صحیح تھا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا مستند ہو میرا فرمایا ہوا
اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہو

دلی کی سکونت دلی میں عرصہ دراز تک قیام رہا، یہیں ان کی شاعری نے عروج پایا اور جوانی ہی میں ان کو مسلم الثبوت اُستاد کے درجے تک پہنچا دیا۔

کھول کر دیوان میرا دیکھ، قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پرشاعروں کا پیر ہوں

جہاں سے دیکھیے اک شعر شورانگیز نکلے ہی قیامت کا سا ہنگامہ ہی ہر جا میرے دیواں میں

ابتدا میں خواجہ محمد ناصر عندلیب کے مشاعرے میں شریک ہوتے تھے، میر نے خواجہ ناصر کو مقتدائے عالم کے نام سے یاد کیا ہی، لیکن نکات الشعرا میں ان کے کلام کو کوئی جگہ نہیں دی۔ ان کے خلف خواجہ میر درد کو بزرگ و بزرگ زادہ، شاعر زور آور ریختہ لکھا ہی اور ان کی خدمت میں بندگی خاص کا اظہار کیا ہی، خواجہ صاحب کے یہاں ماہواری مشاعرے کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، جب بند ہوگیا تو خود خواجہ درد کی تحریک سے میر نے اپنے یہاں مشاعرہ قایم کیا اور خود ہی اس کے میر مجلس ہوئے۔ یہ مشاعرہ ہر مہینہ کی پندرھویں کو ہوتا رہا اور خواجہ صاحب بھی شرکت کرتے رہے۔

لکھنؤ میں آمد بارھویں صدی ہجری کا آخر حصہ سلطنت مغلیہ پر مرہٹوں کی چڑھائی کا زمانہ تھا، زمانہ شاہی دربار (دربار شاہ عالم) کے تنزّل کا تھا۔ عام پریشانی کی وجہ سے شعر و سخن پر بہت بڑا اثر پڑا، اکثر سخنور شعرا نے دہلی سے کوچ کرنے کی زحمت گوارا کی۔ آرزو، سودا، اور میر سوز وغیرہ لکھنؤ چلے آئے لیکن میر عرصہ تک خواجہ میر درد کی تقلید میں دہلی ہی میں مقیم رہے۔ مولوی عبدالحی نے میر سے پہلے میر سوز کا لکھنؤ آنا درج کیا ہی۔ لیکن مولوی عبدالحق نے میر سوز کا بعد میں آنا لکھا ہی۔ زیادہ قابل قیاس یہ ہی کہ میر سوز پہلے آئے ہوں گے اور یہی وجہ ہی کہ وہ نواب آصف الدولہ کے استاد ہوگئے۔ اگر میر پہلے آئے ہوتے تو یقیناً میر ایسے مسلم الثبوت شاعر کو نواب اپنا استاد مانتے۔

بقول میر لطف علی لطف ۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۲ء (زمانہ نواب آصف الدولہ) میں میر دہلی سے لکھنؤ چلے آئے اس وقت اُن کی عمر ۶۰ سال کی رہی ہوگی۔[4]

آزاد نے آب حیات میں میر کے لکھنؤ آنے کا سال ۱۱۹۰ھ لکھا ہی۔ جو شاید کتابت کی

---

[1] نکات الشعرا صفحہ ۵۳ [2] گل رعنا صفحہ ۱۵۲ [3] مقدمہ انتخاب کلام میر صفحہ ۷ [4] گل رعنا صفحہ ۱۵۲

غلطی ہی۔ بہرحال یہ مسلّم ہی کہ سودا کی وفات کے بعد میر لکھنؤ آئے۔ سودا کی وفات ۱۱۹۵ھ میں ہوئی اس سے، اس وجہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کی وفات کی تاریخیں موجود ہیں۔ فخرالدین "شاعرانِ ہند کا سرور گیا" مصحفی "سودا کجا و آں سخن دلفریب او" منت "بگفت گو ہر معنی یتیم شد ہے"[1]

مولوی عبدالحیٔ[2] نے میر کی لکھنؤ میں آمد، ساٹھ سال کی عمر میں خیال کی ہی۔ مولوی عبدالحق[3] نے بھی یہی تخمینہ کیا ہی۔ بعد میں میر حسن اور جرأت بھی لکھنؤ آئے۔ دلّی میں غربت کا سامنا تھا، ظاہرا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا، سلطنت مغلیہ سے کچھ وظیفہ بھی نہ ملتا تھا، بلکہ دربار کی حاضری سے میر گریز کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا کوئی قصیدہ یا قطعہ سلطنت مغلیہ کے کسی بادشاہ کی شان میں موجود نہیں۔

میں خاک میں ملا نہ کروں کس طرح سفر مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہلِ وطن تمام

اسی اثنا میں مرزا رفیع سودا نے جنھیں لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے دربار میں رسائی ہو چکی تھی اور چھ ہزار روپیہ کی جاگیر بھی مل چکی تھی، وفات پائی۔

یہ پہلے لکھا جا چکا ہی کہ اُن کی آمد ۱۱۹۰ھ میں ہوئی اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہی کہ ۱۱۹۰ہجری میں جب میر نے قطعہ تاریخ بدلا اور اپنے حالات میں اپنی عمر ساٹھ سال لکھی تو ایک عبارت جو پہلے نسخہ میں تھی قلمزد کردی وہ یہ ہی: "انہ فاقہا بجاں رسیدم برسالے از کسے نہ کشیدم" ظاہرا اس کا سبب نواب آصف الدولہ کے دربار میں رسوخ تھا۔ سودا کی وفات ہی نے میر کو ضعیفی میں مسکن چھوڑ کر نئے شہر میں سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کیا، دربارِ لکھنؤ کی قدردانیِ سخن، بمقابلہ دربارِ دہلی، زیادہ مشہور ہو چلی تھی۔ میر کا یہ خیال، کہ لکھنؤ میں اُن کی خوبیِ کلام کا زیادہ اعتراف ہوگا اور دربار میں آؤ بھگت ہوگی، بیجا نہ تھا، ان کی شہرت لکھنؤ میں اُن کے آنے سے پہلے ہی پہونچ چکی تھی جب لوگوں کو اُن کی آمد کی اطلاع ہوئی سب نے تعظیم اور استقبال کیا۔ آزاد[4] نے تحریر کیا ہی کہ لکھنؤ پہونچتے ہی سرائے میں ٹھیرے، ایک مشاعرے کی خبر سُنی، اس میں شریک ہوئے، نوجوانانِ لکھنؤ ان کا لباس اور طرز ادا دیکھ کر مسکرائے

---

[1] گل رعنا ص ۱۵۲ [2] مقدمہ ذکرِ میر ص ۵ [3] آب حیات ص ۲۱۱

اس پر میر نے فی البدیہہ، مشاعرے کی غزل کی طرح میں ذیل کا قطعہ پڑھا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو! ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

مولوی عبدالحق نے اس قصہ کو حقیقت سے بعید تصوّر کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ ذکرِ میر میں لکھنؤ آنے کی وجہ نواب آصف الدولہ کی دعوت درج ہے اور نواب سالار جنگ کے یہاں جانا لکھا ہے یہ بات اس قصے کی کسی طور پر تردید نہیں کرتی جب ذکرِ میر میں اُن کی زندگی کے بہت کم واقعات لکھے ہیں اور کسی مشاعرہ کا تو کہیں یہ ذکر بھی نہیں ہے۔ لیکن میر کی کلیات میں اس طرح پر، غزل کا پتہ نہیں چلتا۔

جب نواب آصف الدولہ کو اطلاع ہوئی، انھوں نے بقول آزاد[2] میر کا دو سو روپیہ ماہانہ اور بقول میر لطف[3] تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر دیا۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں دو سو روپیہ مشاہرہ رہا ہو اور بعد میں اضافہ ہو گیا ہو

میر نے نواب آصف الدولہ کی تعریف میں ایک قصیدہ پیش کیا، جس کا زبردست مطلع یہ ہے۔

ہوا کئے ہیں زبس شکوۂ فلک تحریر سیہ ہے کاغذ مشقی کے رنگ لوحِ ضمیر

دونوں شکارنامے نواب آصف الدولہ کے بہرائچ اور کوہ شمالی کے دامن میں شکار کھیلنے کیلئے جانے کے متعلق میر نے موزوں کئے تھے۔

اُستادی میر کی اُستادی دلّی ہی میں مسلم ہو چکی تھی۔ خود خواجہ میر درد نے ان کو اپنے یہاں مشاعرہ کرنے اور میر مجلس بننے کی تحریک کی تھی۔ گو عمر میں سودا ان سے بڑے تھے اور میر کی صغر سنی ہی میں شاعر ہو چکے تھے لیکن وہ غزل گوئی میں میر کو بھی اُستاد مانتے تھے۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ ہونا ہے تجھ کو میر سے اُستاد کی طرف

1 مقدمہ ذکرِ میر صفحہ ح 2 آبِ حیات صفحہ ۲۱۱ 3 گلشنِ ہند صفحہ ۱۵۳

یہ بہت بڑا فخر میر کو خود ان کی حیات ہی میں حاصل ہوا کہ سب ان کو استاد ماننے لگے مسافر ان کی غزلوں کو شہر بہ شہر تحفہ کے طور پر لے جاتے تھے۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت کہ میر اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تسلیم کیے جاتے تھے یہ ہے کہ ان کی حیات ہی میں مرزا لطف علی لطف نے جو اُن کے شاگرد نہ تھے اپنی کتاب گلشن ہند مصنفہ ۱۲۱۵ھ میں، میر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میر شیریں مقال ہیں اور ریختہ گویان سابق و حال میں، نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سفید و سیاہ ہے۔ بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا، تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا"[1]

اسی طرح پر میر کے کلام کا مقبول عام اور رائج ہونا اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۱۲ء میں مسٹر جان شیکسپیر نے اُردو لغت طبع کرائی جس میں ہمعصر شعرا کی نسبت میر کا کلام کثرت سے بطور سند درج کیا گیا ہے۔

میر کی وفات کے بعد سے اب تک کسی شاعر نے میر کے غزل گوئی میں اُستاد ہونے سے انکار نہیں کیا۔ اپنے کلام کے متعلق میر کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز ۔۔۔ تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

میر کا یہ کہنا کہ اُن کے بعد بھی اُن کے پر درد اور حسرت بھرے اشعار لوگوں کے دلوں پر اثر کرتے رہیں گے سچ ثابت ہوا۔

بعد ہمارے اس فن کا جو کہ ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے ۔۔۔ رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

باتیں ہماری یاد رہیں یہ باتیں ایسی نہ سُنئے گا ۔۔۔ پڑھتے کسی کو سُنئے گا تو دیر تلک سر دُھنئے گا

---

[1] گلشن ہند صفحہ ۱۵۲

بعد کے مشہور شعرا ناسخ، غالب، ذوق اور امیر مینائی نے میر کی استادی کی داد دی ہے۔

ناسخ کا شعر ہے۔

میں ہی کچھ ناسخ نہیں ہوں طالب دیوانِ میر
کون ہے جس کو کلام میر کی حاجت نہیں؟

دوسرا شعر ہے

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں[۵۱] آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غالب کا شعر ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

دوسرا شعر

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذوق کا شعر ہے

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

امیر مینائی نے صنم خانہ عشق میں لکھا ہے

سودا و میر دونوں تھے استاد پر امیر
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

آزاد نے لکھا ہے کہ واہ واہ اور آہ آہ کا فرق خواجہ باسط لکھنوی کی ایجاد ہے۔

مولانا حالی[۵۲] نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مومن، شیفتہ، آبرزو وغیرہ ایک روز بیٹھ کر میر کے اس شعر کی طرح پر قافیہ بندی کر رہے تھے

---

۵۱ گلزارِ سخن میں پہلا مصرع یوں تحریر ہے: "ناسخ اپنا تو عقیدہ ہے بقولِ آتش" یہ نقل حقیقتاً غلط ہے کلیات ناسخ میں نہیں پائی جاتی ورنہ آتش کے کلام میں کہیں دوسرا مصرع پایا جاتا ہے اگر دوسرا مصرع آتش کا کہا ہوا ہوتا تو غالب آتش سے نقل کرنے کا اعتراف کرتے نہ کہ ناسخ سے۔

۵۲ مقدمہ دیوان حالی ص۱۲۵

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ایک دوست نے آکر آرزو سے پوچھا کہ آپ کس سوچ میں ہیں جواب ملا کہ قل ہو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں۔

اپنے کمال کا احساس چونکہ تمام لوگ میر کو اُستاد مانتے تھے اور اُن کے کلام کی بیحد عزت کرتے تھے لہذا یہ تعجب خیز بات نہیں ہے کہ خود میر کو اپنی اُستادی کا احساس تھا۔ میر کے متعدد اشعار سے اس احساس کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے کلام کے متعلق جو پیشین گوئی میر نے کی تھی وہ پوری ہوئی۔ اس زمانہ میں تعلّی کا عام رواج تھا۔ کوئی نامی شاعر اپنی بڑائی کرنے سے نہ بچا۔ سودا اور مصحفی حتی کہ انشا نے بھی خوب ڈینگیں ماریں اور دوسروں کی ہجویں لکھیں اس اعتبار سے میر کی تعلی گو اب ناگوار معلوم ہوتی ہے مگر اس زمانہ کے لئے زیادہ غیر مناسب یا ناموزوں نہ تھی۔ قیاس ہے کہ لوگوں نے اس سے بھی لطف اُٹھایا ہوگا اگرچہ عوام نے اس وقت بھی دوسروں کی ہجو اور ان کی ذلت کو اخلاقاً پسند نہ کیا ہوگا۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے صرف اُستادی ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ خدائے سخن ہونے کا دعویٰ ظاہر ہے۔

ریختہ رتبہ کو پہونچایا ہوا اس کا ہے　　　معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا
ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو　　　چاہیئے اہل سخن میر کو اُستاد کریں

مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ انتخاب کلام میر میں ایسے دس اشعار جمع کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب اپنے کمال سے خود واقف تھے اُن کے علاوہ جو اور اشعار میں نے کلیات سے منتخب کیے ہیں اُن میں چار اشعار میر کی پیشین گوئی کے سلسلہ میں منجملہ چھ کے　　　درج ہو چکے ہیں باقی اشعار ذیل میں نقل کرتا ہوں ان میں میر نے اپنی اور اپنے کلام کی بڑائی جتائی ہے۔

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا　　　غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
زمین غزل ملک سی ہوگئی　　　یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا

میر کی بد دماغی کی بحث میں اشعار مندرجہ ذیل سے مدد ملے گی

۲۔ میر کو اپنے فن پر ناز تھا

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا وہی آخر کو ٹھیرا فن ہمارا
تکلیف درد دل کی عبث ہم نشیں نے درد سخن نے میرے سبھوں کو رلا دیا
ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میر جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا
مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میر پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا
ہر ورق ہر صفحہ میں اک شعر شور انگیز ہے عرصۂ محشر کا عرصہ ہے مرے دیوان کا
بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا
جس شعر میں سماع تھا کل خانقاہ میں وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا
گو میر جہاں میں کنھوں نے تجھ کو نہ جانا موجود نہ تھا تو تو کہاں نام و نشاں تھا
رونقِ آبادیِ ملکِ سخن ہے اس تلک ہوں ہزاروں رحم الٰہی میر کے اک دم کے بیچ
پڑھ غزل میر کی جو ہو وے یاد ان کو تو اس میں کہتے ہیں استاد
کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام
کہاں عاجز سخن، قادر سخن ہوں ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں
کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں شعر کیوں میرے کچھ طرز ایسی بھی نہیں ابہام بھی نہیں
غزل میر کی کب پڑھائی نہیں کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں
دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے
سمجھے انداز شعر کا میرے میر کا سا اگر کمال رکھے
اس صنائع کا اس بدائع کا کچھ تعجب نہیں خدائی ہے

میر اپنے زمانے کے عام شعرا کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ان کے کلام کو لغو سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا گفتار خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

ع سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا ع ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

میر کی مثنویوں میں ایک مثنوی اژدر نامہ یا اجگر نامہ ہے، اس میں میر نے اپنے کو اژدر قرار دیا ہے اور دیگر شعراء کو چھوٹے جانور، جو کہ سب اژدر سے ڈرتے ہیں۔ اس کو ایک مشاعرے میں پڑھا۔ آخری شعر سے حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر
گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

میر کا یہ فعل کسی کو پسند نہ آیا۔ محمد امان نثار، شاگرد شاہ حاتم نے ایک قطعہ برجستہ لکھ کر پڑھا۔ سب نے میر کو خفیف کرنے کے لیئے بڑی تعریفیں کیں۔ آزاد نے اس کا ایک ہی شعر نقل کیا ہے۔

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

میر کا غرور عموماً لوگوں کو ناپسند تھا اور اُن کی ہجو میں اکثر اشعار کہے گئے تھے۔ بقول ۔

پگڑی اپنی سنبھالیئے گا میر
اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

مزاج و طبیعت آزاد نے آب حیات میں اکثر حکایتیں نقل کی ہیں جن سے میر کی نہ صرف تنک مزاجی بلکہ بد دماغی ثابت ہوتی ہے۔ ان میں سے چند نقل کرتا ہوں۔

جب دلّی سے سفر کیا تو راستہ میں اپنے ہم سفر مسافر سے بات تک نہ کی، کہ زبان خراب ہو جائیگی دوسرے کے کلام کی قدر نہ کرتے تھے۔ جب کبھی حافظ یا سعدی کا بھی کوئی شعر پڑھا جاتا تو سر نہ ہلاتے اور اس کی تعریف کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ شاگرد بنانے سے گریز کرتے تھے۔ حتیٰ کہ میر قمرالدین منت، سعادت یار خاں رنگین اور شیخ ناسخ کی غزلوں پر اصلاح دینے سے انکار کر دیا۔ اگر کچھ لوگ میر کے مکان پر، اُن کا کلام سننے کے اشتیاق میں جاتے اور پڑھنے کی فرمائش کرتے تو کلام نہ سناتے اور جواب دیتے کہ آپ نہ سمجھیں گے۔ اپنے علاوہ ہمعصروں میں صرف سودا کو شاعر خیال کرتے تھے۔ منقول ہے کہ میر کی رائے میں خواجہ درد صرف آدھے شاعر تھے اور میر سوز جو کہ نواب آصف الدولہ کے کامل اُستاد تھے صرف چوتھائی شاعر تھے۔ دیگر شاعروں کا تو اساتذہ میں شمار ہی نہ تھا۔ نواب کی ملازمت کی حالت میں بھی دربار کی حاضری سے گریز کرتے اور

لہ آب حیات ص ۲۲۳ ۲ ۔ ۔ ۔

دربار میں بہت کم جاتے تھے نواب کی فرمایش سے غزل نہ کہتے تھے۔ غزل پڑھنے کی حالت میں ایک مرتبہ نواب، چھڑی سے مچھلیوں کے ساتھ کھیلنے لگے، میر ٹھیر گئے اور کہنے لگے، جب حضور متوجہ ہوں گے تو پڑھوں گا۔ نواب نے جواب دیا کہ جو شعر ہوگا وہ خود متوجہ کرے گا، میر نے غزل پھر نہ پڑھی اور اپنے گھر چلے آئے چند روز بعد، نواب بازار سے گزرے میر کو دیکھ کر کہا "آپ تشریف نہیں لاتے"، میر نے جواب دیا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفاء کے خلاف ہے۔

نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد جب سعادت علی خاں کا زمانہ آیا تو ایک روز اُن کی سواری تحسین کی مسجد کے قریب سے ہو کر گزری، سب لوگ تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن میر نہ اُٹھے، انشاء اللہ خاں نے نواب صاحب کو بتایا کہ یہ میر تھے۔ نواب نے ملازم کے ذریعہ سے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ بھیجا، مگر میر نے صرف اس وجہ سے واپس کر دیا کہ ملازم لے کر آیا تھا بعد کو انشاء خود گئے اور میر کو راضی کیا، دربار میں کبھی کبھی جانے لگے۔ پھر بھی اگر کوئی بلند مرتبہ فہمر بلاتا تو میر نہ جاتے اور معذرت کر دیتے۔ اُن کا یہ طریقہ صرف امراء ہی کے ساتھ نہ تھا بلکہ سب کے ساتھ تھا۔ میر سوز کے ذکر پر میر نے یہ کہا کہ سوز ایسا تخلص شرفاء میں ہم نے نہیں سُنا حالانکہ میر سوز نے میر کی شہرت کی وجہ سے اپنا تخلص میر چھوڑ کر سوز اختیار کیا تھا۔ نکات الشعراء کے دیباچہ میں میر نے لکھا ہے کہ ہزاروں شاعروں کا ذکر کروں گا، مگر ان ہزاروں میں سے ایک شاعر بھی بیچارہ طعنوں اور ملامتوں سے نہ بچا۔ ولی کے حق میں کہا کہ "ولی شاعریست از شیطان مشہور تر" اس پر میر خاں کمترین نے ایک نظم کہی، جس کا ایک مصرع یہ ہے ؎

"ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں"

نکات الشعراء کے دیباچہ میں میر کے اس دعوے کو کہ اُس وقت تک ریختہ کے شعراء کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا تھا آزاد[۱] نے صحیح نہیں قرار دیا ہے لیکن کسی اور تذکرہ کا حوالہ بھی نہیں دیا ہے مولوی عبدالحیٔ نے گل رعنا میں ان حکایتوں پر شک کا اظہار کیا ہے۔ اور بازار میں نواب سے گفتگو نہ کرنے کو اس بنا پر غلط قرار دیا ہے کہ یہ تو خلل دماغی کی حد تک پہونچتا ہے۔ اوروں کے

---

۱ آب حیات صفحہ ۲۱۱ ۲ گل رعنا صفحہ ۱۵۲

کمال کو نہ دیکھنے کی تردید میں نکات الشعرا کا حوالہ پیش کیا ہے، ولی کے خلاف شان الفاظ کی تکذیب، نکات الشعرا میں اُن کے نہ پائے جانے سے ہوتی ہے۔

اسی طرح سے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے میر کو منکسر المزاج انسان قرار دیا ہے اور ان کے خیال میں، "تذکرہ میں میر کے قلم سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلا جس سے اُن کی خود بینی، خود پسندی، بد دماغی اور تعلّی عیاں ہوتی ہو۔ یہ نتیجہ صرف اس بات پر مبنی ہے کہ میر نے اپنے آپ کو بندہ، فقیر، احقر، عاجز ترین خلائق اور ہیچمدان کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

ایسے ہی مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ ذکر میر میں اکثر قصّوں کو جن کو آزاد نے نقل کیا ہے نا قابل یقین خیال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حکایتیں جو آزاد نے نقل کی ہیں، اُن میں کچھ مبالغہ ہو اور اُن کی بنیاد سُنے ہوئے قصّے ہوں، لیکن تاریخی واقعات اور خود میر کے اشعار سے ان کا منکسر المزاج ہونا تو درکنار بلکہ متکبر اور بد دماغ ہونا ضرور ظاہر ہوتا ہے اور آزاد کی رائے کی پوری تائید ہوتی ہے صرف آزاد ہی نے نہیں بلکہ میر حسن نے بھی میر کو لکھا ہے کہ "بسیار صاحب دماغ است و دماغ اومی زیبد"۔

اگر اُن کا غرور جنون کی حد تک بھی پہونچا ہوا معلوم ہو تو تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ اُن کے چچا مجنون تھے اور میر کو بھی زمانہ شباب میں ایک مرتبہ جنون کا دورہ ہو چکا تھا اور اس مسئلے پر اُن کی مثنوی خواب و خیال سے بھی روشنی پڑتی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ آزاد نے اپنے تذکرہ میں میر پر جو الزام ہزار شعرا میں سے ایک کو بھی طعن اور ملامت سے نہ چھوڑنے کا لگایا ہے وہ بے بنیاد ہے۔ نکات الشعرا کا جو تذکرہ انجمن ترقی اُردو نے چھاپا ہے وہ ایک مختصر رسالہ ہے اور اس میں صرف ۱۰۲ شعرا کا ذکر ہے جس طرح پر اکثر شعرا کا بیان کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر دوسرے شعرا کے کلام کی داد دینے سے قاصر رہے اور نہ میر نے ان کی تعریفیں اُٹھا رکھیں، تذکرہ میں بہت سی جگہوں پر اکثر شعرا کو کلام خیر سے یاد کیا گیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولوی عبدالحیٔ کا یہ خیال کہ آزاد کو نکات الشعرا کا نسخہ دستیاب نہ ہو سکا تھا اور اُنھوں نے یہ الزام محض خیالی طور سے قائم کر دیا، بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تذکرہ میں جب مسلّمہ شعرا کا انتخاب کیا اور ان کے کلام سے منتخب اشعار نقل کیے تو نہ تو ہجو کا موقع تھا اور نہ نکتہ چینی کا اور نہ تحریر میں سب پر حملہ کر کے

۵۱ مقدمہ نکات الشعرا ص ۳ ۵۲ تذکرہ شعرائے اُردو ص ۱۶۵ ۵۳ مقدمہ نکات الشعرا ص ۲۳ ۵۴ گل رعنا ص ۱۵۱

اپنے اوپر حملہ رجوع کرنا کارِ عقلمند ہوتا، ولی کی شان کے خلاف کوئی لفظ تذکرہ میں نہیں، اسی کے ساتھ ولی کے کلام کی تعریف سے بھی عمداً پرہیز کیا گیا ہے، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ "از کمال شہرت احتیاج تعریف نہ دارد"، اگر یہی اصول مدنظر تھا تو سوداؔ یا میر دردؔ کی تعریف بھی بیکار تھی۔ شیخ حاتم کو مرد جاہل قرار دیا ہے۔ بعض چھوٹے شاعروں کی ہجو بھی ہے۔ فی الحقیقت یہ خیال کرنے کی بھی گنجائش ہو سکتی ہے کہ جو نسخہ آزاد نے دیکھا تھا ممکن ہے کہ وہ انجمن ترقی اردو کو دستیاب نہ ہو سکا ہو۔ یا میر نے اصل نسخہ میں بعد کو وقتاً فوقتاً کچھ ترمیم کردی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فی الحقیقت آزاد نے نکات الشعرا کا کوئی بھی نسخہ نہیں دیکھا اور جو کچھ سُنا تھا لکھ دیا۔ اس نسخہ میں اکثر مشہور و مستند شعرا کا نہ تو علحدہ تذکرہ ہے اور نہ اُن کے کلام کا انتخاب مثلاً خواجہ ناصر عندلیب کا کوئی بھی شعر درج نہیں ہے۔ اشرف علی خاں فغاںؔ۔ بقاء اللہ خاں بقاؔ جیسے شعرا کا بھی تذکرہ چھوٹ گیا ہے مگر اکثر چھوٹے شعرا کا کلام درج ہے۔ میر سوز کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نکات الشعرا کے تصنیف کا زمانہ میر کا عہد شباب تھا اور وہی احمد شاہ بادشاہ کی سلطنت کا زمانہ تھا۔

میر کے بد دماغ ہونے کا اس سے زبردست اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود میر کو تسلیم ہے کہ اُن کو لوگ میر بے دماغ کے لقب سے یاد کرتے تھے خود اُن کے احباب میں اُن کا بد دماغ مشہور ہونا، واقعی ان کی بد دماغی کی کافی دلیل ہے، میر ایسے اُستاد کا نام جن کی سب قدر و عزت کرتے تھے اور ان کے کلام کو لوگ سر اور آنکھوں پر رکھتے تھے، ہرگز بد دماغ نہ رکھا جاتا اگر ان میں فی الواقع بد دماغی نہ ہوتی، یہ میر کا تکبر ہی تھا کہ اس شہرت کو اُنھوں نے اپنی بد دماغی پر محمول نہیں کیا بلکہ عوام کی بے دماغی کا سبب خیال کیا۔

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل شورشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

تمام نسخوں میں بے دماغ درج ہے نہ کہ بد دماغ۔ حالانکہ اگر میر بدنام تھے تو بد دماغ یعنی متکبر مشہور رہے ہوں گے نہ کہ صرف بے دماغ جس کے معنی نازک مزاج کے ہیں۔

دوسرا ثبوت اس بات کا کہ اپنے ہمعصروں میں میرؔ سوائے مرزا سودا اور خواجہ میر درد کے

کسی اور کو شاعر نہیں مانتے تھے خود اُن کے کلام سے پایا جاتا ہے۔

کیا رہا ہے مشاعرے میں اب　　لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجہ میر　　کتنے اک یہ جوان ہوتے ہیں

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ میر شاگرد بنانے سے گریز کرتے تھے، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ میر کو بڑے درجے کے شاگرد نصیب نہ ہوئے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ لوگ میر کے شاگرد بننے کے خواہشمند نہ تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ میر کی کج خلقی حائل تھی جو باوجود اُن کی مسلم الثبوت استادی کے نامور شعراء کو ان کی شاگردی کی طرف رجوع نہ کر سکی اور نہ اُن کو، اُن کی ناز برداری کی ہمت دلا سکی۔ ان کے شاگردوں میں، سخن، عشق، آرزو، آبرو، راسخ اور تجلّی ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ، نثار، میاں جگن، محمد محسن، مجنون۔ اور شکیبا بھی ہوئے۔

چوتھا ثبوت خود میر کی تصنیف "ذکر میر" سے ہوتا ہے۔ ایک[1] روز سادات خاں نے میر سے یہ خواہش ظاہر کی کہ قوال کے لڑکے کو اپنے دو تین شعر بتا دیں تاکہ وہ گائے میر نے اس کو ناپسند کیا۔ جب خان نے سر کی قسم دی تو چند شعر یاد کرا دیئے۔ لیکن یہ اس قدر ناگوار خاطر ہوا کہ دو تین روز کے بعد سے اُن کے یہاں کا جانا ترک کر دیا اور باوجود اصرار کے پھر نہ گئے حالانکہ خان نے میر کے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنے یہاں نوکر بھی رکھ لیا۔ راجہ جگل[2] کشور بڑی خوشامد سے میر کو اپنے گھر لے گئے اور اپنے شعر اصلاح کے لئے پیش کئے میر نے ان کو قابل اصلاح بھی نہ سمجھا اور ان پر خط کھینچ دیا، میر نے غصّہ[3] میں آکر راجہ ناگرل کی رفاقت جو اُن پر مہربان تھے بلا کسی معقول وجہ کے ترک کر دی۔ اپنی خانہ[4] نشینی کے سلسلہ میں میر نے خود تسلیم کیا ہے کہ بادشاہ نے اکثر تکلیف دینی چاہی لیکن میر نہ گئے۔ پھر بھی بادشاہ کبھی کبھی کچھ چیزیں بھیجتے رہے۔

پانچویں واقعے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جو یہ ہے کہ اکثر شاگردوں نے میر کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد، میر کو چھوڑ دیا اور دیگر اساتذہ سے تلمذ کرنے لگے ممکن نہیں تھا کہ اگر میر خلیق ہوتے تو یہ لوگ اُن کو چھوڑ دیتے۔

۱؎ ذکر میر ص۸۶　　۲؎ ذکر میر ص۷۵　　۳؎ ذکر میر ص۱۲۱ حاشیہ　　۴؎ ذکر میر ص۱۳۵

مولانا حبیب الرحمن خاں نے ایک ایسے منحرف شاگرد راقم کا کلام نکات الشعرا میں درج کرنے کو اس کا ثبوت قرار دیا ہی کہ میر صاحب بد دماغ نہ تھے۔ حالانکہ راقم کے متعلق یہ لکھ کر کہ "مشق شعر از مرزا رفیع می کند، قبل ازیں از فقیر نیز مشورت شعر می کرد" دل میں کدورت کی وجہ سے میر نے پہلے وہ شعر نقل کیا ہی جس کو لکھا ہی کہ عبدالحیٔ تاباں کے دیوان سے ردیف بدل کر لیا گیا ہی اور آخر میں راقم کو نومشق کے لفظ سے یاد کیا ہی۔

چھٹی یہ بات ہی کہ میر کو رئیسوں کی تعریف کرنا پسند نہ تھی فرماتے ہیں :-

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں

میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

یہ اس سے بھی ظاہر ہی کہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کی شان میں انھوں نے کوئی قصیدہ نہ کہا حالانکہ عمر کا زیادہ حصہ دلی ہی میں بسر ہوا، البتہ نواب آصف الدولہ کی شان میں کچھ قصائد اور مثنویات ہیں لیکن اگلے عنوان کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ میر کو دربارداری سے سخت گریز تھا۔ اپنا درجہ وہ اس قدر اعلیٰ سمجھتے تھے کہ ان کی کتنی ہی قدر کی جائے لیکن وہ اس کو قدر دانی نہ خیال کرتے تھے۔ خیال کرنے کی بات ہی کہ سودا کو دربار لکھنؤ سے دیگر خلعت اور انعامات کے علاوہ چھ ہزار روپیہ کی جاگیر ملی۔ اس کے مقابلہ میں دو سو روپیہ یا زیادہ سے زیادہ تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ کو جو بالالتزام نہ ملتا تھا میر بہت کم سمجھتے تھے اور اسی لیئے اپنی ناقدری تصور کرتے تھے۔ فقر اور گوشہ نشینی کو ایسی دربارداری پر ترجیح دیتے تھے۔

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا خریدار لیکن نہ پایا گیا

کوئی خواہاں نہیں ہمارا میتہ گویا جنس ناروا ہیں ہم

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری

نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی تجھے میر سمجھا ہی یاں کم کسو نے

لـه مقدمہ نکات الشعرا صـ

ساتویں یہ بات ہے کہ خود میر کے اشعار سے ثابت ہے کہ اُن کے خیال میں عوام اُن کے کلام کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے ۔ مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں ؛ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

نکتہ داں بھی خدانے تم کو کیا پر ہمارا نہ مُدعا سمجھے

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز بے حقیقت ہے شیخ کیا سمجھے

آشفتہ حالی دلی کے قیام کے آخر زمانہ میں میر بہت تنگی سے بسر اوقات کرتے تھے۔ جو پہلا نسخہ ذکر میر کا ہے اس میں ۱۱۸۱ھ سے گوشہ نشینی اختیار کرنا بیان کیا ہے۔ اور فاقوں تک کا ذکر کیا ہے۔ بعد کے نسخہ میں یہ آخری فقرہ قلمزد کر دیا۔

آزاد نے لکھا ہے کہ "میر دربار داری کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقرو فاقہ میں گذارہ کرتے رہے"۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کی اس رائے کی کافی تائید میر کے طرز کلام سے ہوتی ہے۔ درد آمیز مضامین، مایوسانہ خیالات، رنج کی باتیں اور رونا دھونا اُن کے اشعار میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ جو ہجو انھوں نے اپنے مکان کی کی ہے وہ سراپا غربت کا نمونہ ہے۔ جا بجا جو اشعار اپنے متعلق لکھے ہیں اُن سے بھی تلخ زندگی کا بسر ہونا پایا جاتا ہے۔

کسب اور کیا ہوتا عوض ریختہ کے کاش

پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کے

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

گل رعنا میں مولوی عبدالحئی نے اس واقعہ نگاری پر اعتراض کیا ہے اور اُن کی رائے میں میر کا وظیفہ آخر وقت تک بند نہ ہوا تھا۔ اس کی سند میں میر لطف علی کا مقولہ گلشن ہند سے نقل کیا ہے کہ "اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد وزارت میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں وہی حال ہے"۔ اس کا معقول جواب خود گلشن ہند میں ہی موجود ہے جو تعجب ہے کہ نظرانداز ہوا۔ میرزا خود لکھتے ہیں[۱] کہ "میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی

[۱] گلشن ہند صـ۱۵۲

بیان میں معانی پرداز ہی مقال کا۔ وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہی، اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہی۔" یہ دونوں قول صرف ایک ہی مصنف کے ہیں جو ظاہراً متضاد ہیں حقیقت میں ایک حد تک دونوں صحیح ہوسکتے ہیں۔ شاہی دفتر میں وظیفہ کا اندراج قائم رہنا ایک چیز اور اس کا برابر ملنا بالکل دوسری چیز ہی۔ تنخواہ بند نہ ہو لیکن اگر بقول غالبؔ مردہ کی چھ ماہی ہوئی تو اس سے تکلیف اور تنگی قایم رہی اس قسم کا دستور ہندوستانی سلطنتوں کے زمانہ انحطاط میں تعجب خیز نہ تھا۔ خود میرؔ کے اشعار سے اس کی کافی تائید ہوتی ہی۔

مدت مدید گزری بجھے کرتے انتظار تخجلت ہوئی جو حال لکھا میں نے بار بار
اس فرد دستخطی کو ہی یہ ماہ ہفتمیں تنخواہ کا نہیں ہی ٹھکانا ابھی کہیں
برسوں ہوئے مہینوں کے وعدے ہوئے عید سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ان جھوٹوں سے بعید

دربار سے متواتر غیر حاضری خود میر کے کلام سے ثابت ہی۔ اول تو مزاج میں اس قدر تکبّر تھا کہ خوشامد کرنا جو اس وقت آداب درباری میں داخل تھا ان کو گوارہ نہ تھا۔ دوم یہ کہ میر کو قصیدہ گوئی پر اعلےٰ پیمانہ کی قدرت نہ تھی۔ اور وہ شوکتِ الفاظ جو دربار کے لیئے زیبا ہی اُن کی مایوسانہ طبیعت اور غم زدہ پست ہمتی، اُن کے لیئے مہیا نہ کرنے دیتی تھی۔ سوداؔ کا زمانہ گزر چکا تھا، جس نے قصیدہ کا رنگ چمکا دیا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں سودا کے کلام کا دبدبہ گھر کیئے ہوئے تھا۔ صرف غزلیات سے وہ مزہ نہ مل سکتا تھا۔ نواب کے سامنے صرف ایک غزل پڑھنے سے وہ اثر نہ پیدا ہوسکتا تھا جو ایک شاندار قصیدہ سے ہوتا ہے۔ قصائد پر قادر الکلامی درباری ترقی کے لیئے لازم ملزوم ہی۔ یہی وجہ ہی کہ سوداؔ کی آؤ بھگت دربار میں بمقابلہ میرؔ زیادہ ہوئی۔ میرؔ کے لیئے ایک خاص دقت یہ پیدا ہوئی کہ ان کے لکھنؤ کی آمد سے پہلے سودا کا زمانہ فوراً ہی گزرا تھا۔ اور اُن کے اخیر زمانہ میں انشا ایسا برجستہ گو، شوخ زبان اور حاضر جواب شاعر پیدا ہوا۔ گو فن شاعری میں میرؔ سے اُس کو کوئی نسبت نہ تھی بجز شستہ زبان اور پھکڑ کا مقابلہ تھا۔ پھر بھی اس کا طرز نواب کے پسندِ خاطر تھا۔ جس نے دربار پر اپنا سکّہ جما لیا۔ صرف درد آمیز اور غمزدہ کلام ہمیشہ کا رونا، جو میر کا خاصہ تھا، درباری شان کے لیئے موزوں نہ تھا۔ اس لیئے تعجب کی بات نہیں ہی کہ میرؔ شکستہ دل ہوکر دربار سے گریز کرنے لگے۔ رنجیدہ خاطر اور مایوسانہ زندگی گھر بیٹھے بسر کرنے لگے

خود اُن کے اشعار اس طرزِ معاشرت کا اظہار کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ۔

تھا میں فقیر پر نہ گیا شاہ کے حضور اتنے لیئے کہ رُتبۂ عزت مرا ہی دور

آداب سلطنت سے نہیں مجھ کو رابطہ حرکت نہ ہوتی مجھ سے کوئی غیر ضابطہ

صحبت خدا ہی جانے پڑے کیسی اتفاق کیا بات آوے بیچ میں بے ربطگی ہو شاق

ناقدردانی اور تنگی سے ضعیفی میں دلّی چھوڑ کر لکھنو آئے۔ ذکرِ میر کے پہلے نسخے سے معلوم ہوتا ہے کہ پچاس سال ہی کی عمر میں میر کو بیماری ضعف بصارت اور ناتوانی کی شکایت[1] چلی تھی لکھنؤ میں عزت و قدر کیئے جانے کے باوجود اُن کے حسب خواہش اُن کی خاطر داری نہ ہوئی۔ آخر عمر تک روتے ہی گزری۔ اکثر اپنے پہلے وطن دلّی ہی کو یاد کرتے تھے۔ اور وہاں سے لکھنؤ چلے آنے پر افسوس کیا کرتے تھے۔

مزا یہ دہلی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

متاعِ ہنر پھیر لیکر چلو بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

بہرحال دلی واپس جانے کی کبھی ہمت نہ پڑی اور نہ وہاں فارغ البالی کی کوئی زیادہ اُمید ہو سکتی تھی۔ اس لیئے صبر و قناعت کے ساتھ لکھنؤ ہی میں مقیم رہے۔

بے زری کا نہ کر گلہ غافل

رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

لکھنؤ آنے کے زمانہ میں جب اُن کی عمر ساٹھ[2] سال کی ہوگئی تو ناسازی مزاج بڑھ گئی لوگوں سے ملاقات کرنا ترک کر دیا۔ اکثر اوقات بیمار رہا کرتی تھی۔ آنکھوں میں درد ہونے لگا ضعف بصر کی شکایت ہوگئی۔ عینک کا استعمال شروع کیا۔ ضعف قویٰ، بے دماغی، ناتوانی دل شکستگی اور آزردہ خاطری محسوس ہونے لگی لیکن آخر زمانہ تک شعر گوئی نہ چھوڑی حتیٰ کہ جب آواز بالکل پست ہوگئی تھی اور مشکل سے مشاعرہ میں غزل پڑھ سکتے تھے، بلند آوازی سے پڑھنا تو درکنار، تب بھی جیسا مرزا قتیل نے اپنے رقعات میں لکھا ہے اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے مگر اس بات کا احساس بھی کرتے رہے کہ بوجہ ضعیفی اور اضمحلال قوائے جوانی کا زور باقی نہ رہا۔

---

[1] ذکر میر ص ۱۵۲ [2] ذکر میر ص ۱۵۲–۱۵۳

لطفِ سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میرؔ
اب شعر ہم پڑھے ہیں تو وہ شد و مد نہیں

میرؔ کس کو اب دماغِ گفتگو
عمر گزری ریختہ چھوڑا گیا

اکثر اپنی جوانی کی شان کو یاد کرکے افسوس کرتے تھے اور ضعیفی کے عالمِ بیکسی پر رنج۔

یہ میرؔ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا

جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا
منہ تکیئے غزل پڑھیئے عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا
ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوبِ جہاں تھا

وفات میر کا انتقال بمقام لکھنؤ سنہ ۱۲۲۵ھ میں ہوا۔ وہیں دفن ہوئے لیکن افسوس ہے کہ باوجود اس شہرت کے اُن کی قبر پر نہ تو کوئی سنگ نصب کیا گیا اور نہ کہیں مزار بنا۔ اس لیئے اس کا بھی پتہ نہیں ہے کہ کس جگہ دفن ہوئے۔ سن وفات کا تعین ناسخ کی کہی ہوئی تاریخ سے ہوتا ہے "واویلا مُرد شہ شاعراں"۔ جو مطابق ۱۸۱۰ء ہے۔

بقولِ[1] آزاد اُن کی عمر ۱۰۰ برس کی تھی۔ مولوی عبدالحی[2] نے بھی یہی تخمینہ عمر کا نقل کیا ہے۔ اور پہلے مولوی[3] عبدالحق نے بھی اس کو صحیح مانا تھا۔ اب ذکر میر کے شایع ہوجانے کے بعد اُنھوں[4] نے عمر کا تخمینہ ۹۸ سال کیا ہے۔ مصحفی[5] کے تذکرہ کی تاریخ کے حساب سے ۷۹ سال ہوتے ہیں لیکن جہاں نے ان کی عمر ۱۰۰ ہی برس لکھی ہے۔ میں نے جو سنہ ولادت کا نکالا ہے اُس (یعنی سنہ ۱۱۳۶ھ) کے حساب سے میر کی عمر قریب ۹۰ سال کی ہوتی ہے۔ دوسرے کی عمر کے تخمینہ کرنے میں خصوصاً جب وہ بہت ضعیف ہو اور اس کے قویٰ مضمحل ہوں بہت غلطی ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ مصحفی نے میر کی عمر کو بہت زیادہ تصور کیا۔ چونکہ میر کا انتقال لکھنؤ میں ہوا اسی وجہ سے آزاد کو ان کی عمر کی صحیح واقفیت نہ ہوسکی۔

اُن کے تاریخی حالات کے ختم کرنے میں خود ان کا شعر جو حسب حال تھا آخر میں درج کرنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اب خدا مغفرت کرے اس کو
میرؔ مرحوم تھا عجب کوئی

[1] آبِ حیات ص ۲۱۲ [2] گُلِ رعنا ص ۱۰۹ [3] مقدمہ انتخاب کلام میر ص ۴ [4] مقدمہ ذکر میر ص ک [5] مقدمہ ذکر میر ص ع

طرز کلام میر کے کلام کی خصوصیت ان کی سادگی ہے۔ روزمرہ کے سہل اور آسان الفاظ میں حسن و خوبی سے اظہار خیال کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے سلاست زبان اور صفائی ان کا خاص حصہ ہے۔ ان کے کلام کو اگر سہل ممتنع کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا مثلاً

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا   لہو آتا ہے جب نہیں آتا

اشعار زیادہ تر دردآمیز ہیں۔ سوز و گداز سے بھرے ہوئے ہیں۔ نالہ و زاری اور حسرت و یاس سے پُر ہیں۔ ظرافت چھو بھی نہیں گئی ہے

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا   دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ان کی مایوسی اور زندگی کی ناکامی کا پتہ اشعار ذیل سے چلتا ہے۔

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

مانند شمع آتش غم سے پگھل گیا   ہم جہاں میں روتے ہی روتے میں گل گیا

چھوٹی بحروں میں غزلیات کہنے میں میر کے ہم پلہ کوئی دوسرا شاعر اب تک نہ ہوا۔ خاص خاص قافیوں اور بحروں میں جو اُن کی طبیعت کے مناسب تھے۔ لاجواب اشعار ان کے قلم سے نکلے ہیں مولانا حالی کا قول ہے کہ غالبًا سب سے پہلے میر ہی نے زبان اُردو میں عشقیہ قصے مثنوی کے طرز میں بیان کیے ہیں۔ زبان کی سادگی اور سلاست ہی کی وجہ سے آزاد نے میر صاحب کو سعدی ہند کہا ہے۔ حقیقت میں اگرچہ شستگی، پاکیزہ بیانی، سادگی اور تاثیر کلام کے اعتبار سے میر کا رتبہ سب سے اعلیٰ ہے لیکن فطرۃً وہ پژمردہ دل تھے۔ دردمند خیالات میں محو رہا کرتے تھے۔ خندگی یا بشاشت تو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اسی لیئے ہمیشہ دردآمیز شعر نکلتے تھے۔ ہجر، غم اور درد کے تذکرہ سے ان کو دلبستگی تھی ناکامی عشق ہی کا ذکر بار بار آتا تھا عیش و نشاط یا وصل کا ذکر ان کے کلام میں بہت کم ہے۔ دردانگیز اور مایوسانہ طرز فی الواقع اُن کے مزاج کی ساخت کا پتہ دیتا ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زندگی پریشانی میں بسر ہوتی تھی۔ کلام سے جو حسرت اور مایوسی ٹپکتی ہے اس کی وجہ ان کی زندگی کے واقعات ہیں

عمر کا زیادہ حصہ یعنی ساٹھ سال دلّی میں بسر ہوا۔ لیکن یہ زمانہ دلی کی تباہی کا تھا۔ برابر ہر قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب حالت ناقابل برداشت ہو گئی تو لکھنؤ کی شہرت سن کر بڑی اُمیدوں کے ساتھ باوجود ضعیفی و ناتوانی و بیماری کے لکھنؤ چلے آئے پہلے تو بڑی آؤ بھگت اور خاطر و مدارات ہوئی لوگوں نے بڑی عزت کی اور استاد تسلیم کیا۔ لیکن میر کی طبیعت دربارداری کے لیئے مناسب نہ تھی، تعریفی شعر یا قصائد میں سودا جیسی مہارت نہ تھی اور نہ انشا جیسی برجستہ کلامی۔ عمدہ غزلیں ان کی طبعزاد ہیں کسی کی فرمائش پر غزل کہنے میں تامل ہوتا تھا۔ میر ایک فطرتی شاعر تھے۔ کلام میں آمد تھی آورد نہ تھی یہی وجہ ہوئی کہ شاہی دربار میں اس قدر رسوخ نہ ہو سکا جیسی کہ انھیں توقع تھی طبیعت نے تکبر اور تنک مزاجی پائی تھی۔ بالآخر مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔

مولوی عبدالسلام نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میر کو قصائد پر قادر الکلامی حاصل تھی۔ لیکن بقول مولوی سید علی حیدر طباطبائی اُن کے قصائد بے مزہ اور پھیکے ہیں البتہ وہ مثنویات کے موجد اور عمدہ نمونہ ہیں۔ ان میں قدرتی انداز ہے۔ ان ہی کی بدولت مثنوی کو ترقی ہوئی۔ میر حسن اور شوق کو انھیں کا مقلد سمجھنا چاہیئے۔ باوجود اس کے یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اکثر مثنویات جن میں کُتے، بلی، بکری اور مرغ وغیرہ کے قصے درج ہیں نہایت گری ہوئی ہیں۔ بعض مثنویوں میں ہندی کے ٹھیٹھ اور ثقیل الفاظ ہیں، بعض میں فحش قصے نظم ہیں۔ ان کی رباعیات اور قطعات میں بھی وہی درد وغم موجود ہے۔ اگر نصیحت بھی کرتے ہیں تو وہی حسرت آمیز۔ قطعہ

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا　　　یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　　میں بھی کبھو کسو کا سرِ پرغرور تھا

اور حسرت و مایوسی کا اظہار تو ہمیشہ رہتا ہی ہے

رباعی

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا　　　میخانہ میں جوشِ بادہ نوشاں دیکھا
اِک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے　　　دیکھا سو محلۂ خموشاں دیکھا

دیگر

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے　　　خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے

یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہی ہم نے

نکات الشعرا میں خود میر نے اپنے کلام میں سے کچھ اشعار منتخب کیے ہیں ظاہر ہی کہ یہ وہ اشعار ہیں جن پر ان کو خود فخر تھا اور ان کے مایۂ ناز تھے جنھیں وہ بہترین خیال کرتے تھے۔ ان میں سے چند اشعار یہ ہیں۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
مونڈ رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہی کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہی حباب
کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں اس غمکدہ میں آہ دل خوش کہیں نہیں
کیونکہ کہیئے کہ اثر گریۂ مجنوں میں نہ تھا گرد نمناک ہی اب تک بھی بیابانوں کی

بعض اشعار تو اس جوش کے ہیں کہ میر کی خود پیشین گوئی کے مطابق جب تک اردو زبان قایم ہی ہمیشہ یاد رہیں گے مثلاً

مغاں جو مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہوئے گا مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے روئے گا
ابر اٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا میخانہ پر بادہ کشوں کا جھرمٹ ہیگا شیشہ اور پیمانہ پر

میر کے اکثر اشعار ضرب المثل اور زباں زد خلائق ہوگئے ہیں۔

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر پھر ملیں گے اگر خدا لایا
ابتدائے عشق ہی روتا ہی کیا آگے آگے دیکھیے ہوتا ہی کیا
شرط سلیقہ ہی ہر اک امر میں عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

ایک مشہور شعر یہ بھی ہی۔

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو اب ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

تصانیف علاوہ مثنویات کے جن کا انتخاب پیش کیا جاتا ہی۔ میر کی غزلیات چھ مکمل دیوانوں کی صورت میں ہیں۔ پانچ قصیدے چھ مخمس ترجیع بند اور ایک ہشت بند بھی ہی۔ رباعیات، قطعات، واسوخت موجود ہیں۔ فارسی کا ایک دیوان اور فارسی ہی میں ایک تذکرہ

نکات الشعرا کے نام سے جو دلی میں احمد شاہ کے زمانے میں لکھا گیا تھا، دستیاب ہے۔ لیکن اس میں نہ تو تاریخی زمانہ کے لحاظ سے کوئی ترتیب ہے اور نہ حروف تہجی کے موافق۔ فارسی میں ایک رسالہ فیض میر بھی موجود ہے جس کو حال میں مولوی مسعود حسن رضوی نے مع ترجمہ کے شایع کیا ہے۔ آخر میں جو لطیفے درج تھے اور اکثر فحش تھے ان کو نہیں چھاپا ہے۔ سب سے زیادہ کارآمد کتاب ذکر میر ہے جس میں میر نے اپنی خود سوانح عمری فارسی میں لکھی ہے۔ اس کتاب سے میر کے حالات زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس کو شایع کرکے انجمن ترقی اُردو نے اُردو دانوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

موازنہ میر و سودا میر و مرزا دونوں اپنے اپنے فن کے مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ مجموعی حیثیت سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا دُشوار ہے۔ ہر ایک کسی خاص صنف شاعری میں دوسرے سے تجاوز کر جاتا ہے۔ تعلّی اور اپنی بڑائی خود کرنا اس زمانے کا عام دستور تھا اس لیئے دونوں صاحب اپنے آپ کو ریختے کے نہ صرف اُستاد بلکہ موجد قرار دیتے تھے۔ سودا نے طنزاً کہا ہے۔

جن روزوں میں حاصل تھا سخن کا اسے کمال
تھی میر کی جب مبتدیانہ یہی تقریر

میر کی آشفتہ حالی کے ذکر میں لکھا جا چکا ہے کہ کچھ تو فطری تکبر اور خود پسندی کی وجہ سے دوسروں کی تعریف کرنا گوارا نہ کر سکتے تھے اور کچھ غم زدہ طبیعت کی پست ہمتی اور طبیعت میں جوش و خروش نہ ہونے کی وجہ سے، پر شوکت الفاظ جو قصائد کے لیئے ضروری ہیں مہیا نہ ہو سکتے تھے۔ قصیدہ کہنے کے لیئے بلند پروازی جو بلا ہمت افزائی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ضروری ہے اور قصائد پر قادر الکلامی درباری ترقی کے لیئے لازم و ملزوم ہے۔ صرف رنج و غم کی کہانیوں اور ہجر کی دوامی ناکامیوں سے کچھ کام نہیں چل سکتا اسی لیئے میر کو شکستہ دل ہو کر دربار سے علٰحدگی اختیار کرکے گوشہ نشین ہونا پڑا۔ اس کے مقابلہ میں سودا اپنے قصائد سے درباروں میں رنگ جما چکے تھے۔ اور قصیدہ گوئی میں جو رتبہ حاصل کر چکے تھے اس کا عشر عشیر بھی میر کو میسر نہ ہوا۔ میر کے قصائد پھیکے اور مقابلتاً بے لطف ہیں۔ ان کے اشعار پست اور تعداد میں بھی کم ہیں چونکہ قصیدہ درباری عزت کا ذریعہ تھا اس کی وجہ سے سودا کو شاہی دربار میں کافی عروج نصیب ہوا۔ اور میر تو انشا جیسے پھکّڑ شاعر کے مقابلہ میں بھی رسوخ حاصل نہ کر سکے اور

نہ ہجو گوئی میں کوئی کمال پیدا کیا۔ قصائد میں سودا اور میر میں وہی فرق رہا جو زمانہ مابعد میں ناسخ و آتش اور ذوق و غالب میں ہوا۔

برعکس اس کے غزل گوئی میں میر کا مرتبہ سودا سے بلند تر ہے۔ پاکیزہ اور عمدہ اشعار کہنے کے لئے عُسرت، خانہ نشینی، ناکامی زندگی نہایت مفید ثابت ہوئی، درد اور نازک خیالی پیدا کرنے کے لئے مایوسی اور حسرت نے ایک کافی سرمایہ بہم پہونچایا۔ جس نے ان کی غزلوں کو ہر دلعزیز بنا دیا سودا گوشہ نشیں یا قناعت پسند نہ تھے۔ درباری زندگی عیش سے بسر کی۔ ان کی غزلوں میں میر کا سا درد نہیں ہے۔ اور نہ زبان اس قدر سلیس اور سادی ہے۔ سودا مشکل زمینوں میں غزلیں لکھتے تھے اور زور دار الفاظ استعمال کرتے تھے جس طرح سودا کو قصائد اور قطعات میں فوقیت حاصل تھی، اسی طرح میر کو غزلیات رباعیات اور مثنویات میں۔

موازنہ کے لئے دونوں اُستادوں کے قصائد جو ایک ہی بحر و قافیہ اور ردیف میں ہیں۔ اُن کے مطلع کا ایک ایک مصرعہ درج کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

میر ؛ جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل

سودا ؛ اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل

سودا اور میر میں ایک یہ فرق بھی تھا کہ سودا زود گو شاعر تھے اور برجستہ شعر کہتے تھے۔ میر فرمایش پر اشعار کہنے میں تامل کرتے تھے۔ بقول آزاد جب ایک مرتبہ بادشاہ نے اُن سے شعر کہنے کی فرمایش کی تو ان کو ناگوار ہوا۔ ذوق نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر ٹہل ٹہل کر ایک ایک مصرع سوچا کرتے تھے۔ دربار میں فطری اور غیر فطری شاعر کا مقابلہ نہ ہوتا تھا بلکہ قصیدہ گو اور غزلخواں کا مقابلہ کیا جاتا تھا بجائے رونے کے تعلی کی زیادہ قدر تھی سید ابطہ علی نے میر و مرزا میں جو فرق آہ آہ اور واہ واہ کا بیان کیا ہے اور جس کو امیر مینائی نے ایک شعر میں نظم کیا ہے بالکل صحیح ہے۔ بقا اللہ خاں بقا کا مصرع "ایک تو تو کہے ہے ایک ہے ہے" دونوں کی ہجو میں ہے۔

مشہور تذکرۂ آبِ حیات میں آزاد نے دونوں شاعروں کی طبیعتوں کے مختلف رجحان کو اُن کے اشعار سے نمایاں کیا ہے مثلاً

میر؛ ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

سودا؛ چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا صبا نے تیغ کا موجِ رواں سے کام لیا

ایک شعر سے اُداسی اور نا اُمیدی ٹپکتی ہے اور دوسرے سے بلند ہمتی اور دلیری۔

مقابلہ کے لیئے ایک ایک اور شعر جو زبان زدِ خلائق ہے درج کیا جاتا ہے۔

میر؛ سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سودا؛ سودا کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

جب تک سودا اور میر دلی میں رہے باہم اتحاد رہا۔ ایک دوسرے کو استاد بھی تسلیم کرتے تھے۔ میر نہ ہو کیوں ریختہ بے سوزش و کیفیت و معنی

گیا ہو میر دیوانا رہا سودا سو مستانہ

سودا سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ

ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

بعد کو یہ نوبت ہوئی کہ،

میر۔ طرف ہونا مرا مشکل ہے اب اس شعر کے فن میں

یونہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

سودا بھی جواب سے نہ چوکے۔

سودا۔ نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے

وہ ان طرحوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

حقیقت میں اپنے اپنے طرز میں دونوں استاد اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بحالت مجموعی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا نازیبا ہے

شاہ محمد سلیمان

الہ آباد ۱۵ / مارچ ۱۹۳۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعجازِ عشق

(۱)

حمد

ثنائے جہاں آفریں ہو محال — زباں اس میں جنبش کرے کیا مجال
کمالات اُس کے ہیں سب پر عیاں — کرے کوئی حمد اس کی سو کیا بیاں
کہوں کیا میں اس کی صفاتِ کمال — کہ ہو عقلِ کُل یاں پریشاں خیال
خرد کنہ میں اس کی حیران ہو — کہاں یاں پریشاں پشیمان ہو
زمین و فلک سب ہیں اس کے حضور — مہ و خور ہیں اس سے ہی لبریزِ نور
یہ صنعت گری اس ہی صانع سے آئے — کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے
نہ آوے کسی کی جو ادراک میں — سو رکھ جاوے وہ اس کفِ خاک میں
پرے ہو گا تمثیل و تشبیہ سے — منزہ ہو وہ بلکہ تنزیہ سے
وہی حاصلِ مزرعِ آسماں — کیے اُن نے دانے میں خرمن نہاں
سفید و سیہ کو نہیں اس کے بار[۱] — دری[۲] ہو زمانے کی لیل و نہار
سوا اس کے نقصاں ہو گر دیکھیے — کمال اُس کے ہی ہیں جدھر دیکھیے
سررشتہ ہو خلق کا اس کے ہاتھ — وہ شب باز ان پتلیوں کے ہو ساتھ
سبھوں میں نمود اُس کی ہی شان ہو — یہ قالب ہیں سارے وہی جان ہو
گل و غنچہ و رنگ و بو و بہار — یہ سب رنگ اللہ کے ہی ہیں یار
اگرچہ ہیں یاں سب کی طرحیں جدا — یہ سب طرحیں ہیں ایک نامِ خدا

۱؎ بار: دربر۔ ۲؎ دری: شطرنجی۔

سما ارض و خورشید یا ماہ ہے
جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے

نظر کر کے ٹک دیکھ ہر جا ہے وہ
نہان و عیاں سب میں پیدا ہے وہ

بہر صورت آئینہ ہے گا جہاں
یہ سب عکس اُس کے ہی پڑتے ہیں یاں

ملک جن و حیواں جماد و نبات
جو اس بِن ہیں توصیف ہے کائنات

وجود و عدم اس سے دونوں ہیں شاد
وہی ہے گا مبدا وہی ہے معاد

مجھے ساقی دے کوئی جامِ عقیق
ولیکن لبالب ہو اس میں رحیق

رکھے آپ میں جس کی آمد مجھے
کہ درپیش ہے نعتِ احمد مجھے

نعت

ثنا جانِ پاکِ محمد کے تئیں
درود و تحیات احمد کے تئیں

رسولِ خدا و سرِ انبیا
زہے حشمت و جاہ صلِ علےٰ

دیا[1] مجلسِ کبریا کا ہے وہ
شرف دودمانِ قضا کا ہے وہ

سب اس صفحے میں ہیں ظہورِ خدا
پر اس سے عبارت ہے نورِ خدا

جہاں وہ ہے واں جبرئیلِ امیں
اُڑے حشر تک تو پہونچتا نہیں

کروں اُس کی قربت کا کیا میں بیاں
کہ تھا قاب قوسین ادنےٰ مکاں

مرا زیرِ پا اس کے فرقِ نیاز
کیا جس کی خلقت پہ صانع نے ناز

بصورت اگر عبدِ مشہود ہے
حقیقت کو پہونچو تو معبود ہے

نہیں پا شکستوں کا اب دستگیر
محمد بن اور آل بن اس کی ۔ میر

گنہگار ہوں چشم ایک اس سے ہے
توقع شفاعت کی ایک اس سے ہے

درود و آل پر اُس کی ہر صبح و شام
وہ ہے شافعِ حشر و خیر الانام

پلا ساقیا بادۂ لعل گوں
کہ ہو جائیں سُرخ آنکھیں مانندِ خوں

[1] چراغ۔

ہو اب حرفِ مستانہ کا دل میں جوش
کر آویزۂ گوش گر کچھ ہے ہوش

مناجات

مرا زخم یارب نمایاں رہے
پس از مرگ صد سال خنداں رہے

رہے دشمنی جیب سے چاک کو
صبا دوست رکھے مری خاک کو

مژہ اشکِ خونیں سے سازش کرے
غمِ دل بھی مجھ پر نوازش کرے

جگر سے طپیدن موافق رہے
مرادِ دل مجھ پہ عاشق رہے

جو نالہ ہو شبگیر کا روشناس
وہ آٹھوں پہر ہی رہے میرے پاس

مژہ گرمِ افسوس و نمناک ہو
کہ سیلابِ آتش پہ خاشاک ہو

کرے نیزہ بازی یہ آہِ سحر
کہ خورشید کی پھوٹ جاوے سپر

خموشی سے مجھ کو رہے گفتگو
اُڑے پر لگا کر مرا رنگِ رُو

نہ مرہم سے افسردہ ہو داغِ دل
شگفتہ رہے یہ گلِ باغِ دل

سدا چشمِ حیرت سے نسبت رہے
مجھے دیکھ رہنے کی فرصت رہے

اگر ضعف ٹک کسبِ طاقت کرے
مری ناتوانی قیامت کرے

مری بیکسی نازبردار ہو
مروں میں تو مرنے کو تیار ہو

بیاباں میں آشفتہ حالی کروں
کہیں تو دلِ پُر کو خالی کروں

کریں دونوں عالم ملامت مجھے
ڈبو دیوے اشکِ ندامت مجھے

مرا ہاتھ ہو چاک کا دستیار
کہ تا جیب و دامن ہو قربِ جوار

جنوں میرے سر پر سلامت رہے
بیاباں میں مجھ سے قیامت رہے

بھٹکنے سے مجھ کو نہ ہو وا[1] رہی
بھلا وے خضر کو مری گُم رہی

جو ہو گرمِ رہ پائے پُر آبلہ
تو ہو جائے سردِ آتشِ قافلہ

ارے ساقی ای غیرتِ آفتاب
کہاں تک ہیں خونِ دل کی شراب

1 رستگاری۔ خلاصی

کبھو ساغرِ بادہ کی دید ہو
محرم ہمارا کبھو عید ہو

تعریفِ عشق

زہے عشق نیرنگ سازی تری
کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری

تجھی سے ہے اب رُخ زرد زرد
تجھی سے مرے دل میں اُٹھتا ہے درد

تجھے ربط کفار و دیں دار سے
تجھے رشتہ تسبیح و زنار سے

تجھی سے ہے بلبل کو نوحہ گری
تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری

ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے
ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے

تجھی سے دلِ شاد غمناک ہے
تجھی سے مرا سینہ صد چاک ہے

تمنا کو تو نے کیا ہے شہید
تجھی سے نہ بر آئی میری اُمید

تجھی سے ہے مجنون صحرا نورد
تجھی سے ہے فرہاد کوہوں پہ مرد

تجھی سے گلو بند ہے خستگی
تجھی سے ہے وابستہ دل بستگی

تجھی سے دلِ عاشقاں ہے کباب
تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب

ترا کام دینا ہے بدنامیاں
تری پیچ دیکھے ہے ناکامیاں

تجھی سے سراسیمہ ہیں یار لوگ
تری تیغ سے قیمہ ہیں یار لوگ

تجھی میں ہیں یہ کار پردازیاں
تجھی پر ہیں موقوف جاں بازیاں

مجھے اس کے چھپنے کا سودا رہا
ولیکن ترا راز رُسوا رہا

لہو اپنا عاشق پیا ہی کیے
ترے جرم پر جی دیا ہی کیے

ترا ہی نمک خوار ہے زخمِ دل
کہ مرہم سے بیزار ہے زخمِ دل

مجھے اک ہی مژگاں سے یہ ربطِ اشک
کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبطِ اشک

کدھر ہے تو اے ساقیِ لالہ فام
یہ لغزش ہے تجھ بن کہ بہکا کلام

کہاں تک کوئی خون دل کو پیئے
کوئی کیونکہ اس رنگ ظالم جیئے

قصہ بزبانِ آوری

نظر جا پڑی جو مری ایک سو — سرِ راہ بیٹھا تھا اک خوب رو
فقیرانہ سی جھولی اک اس کے پاس — گلے میں نہایت مکلف لباس
سرا و پر تھا ہنگامہ اک اس کے جمع — پتنگے اکھٹے ہوں جوں گردِ شمع
لقب اس کا دیوانۂ عشق تھا — کہ شہرت میں افسانۂ عشق تھا
جوانی کے گلشن کا وہ تازہ گل — کرے جس کی خاکِ قدم غازہ گل
اسی کی سی مقدور تک سب کہیں — سدا اس کا منھ دیکھتے ہی رہیں
وہ اک دودماں کا تھا روشن چراغ — جلاتے تھے سارے اسی پر دماغ
ولے اس کے دل میں اک آتش نہاں — کہ دیکھے جلا اس نے سارا جہاں
سب آرام چاہیں اسے اضطرار — سراپا تلک اک دلِ بے قرار
نہ کچھ ہوش گھر جانے کا اس کو تھا — تشتت نہ مرجانے کا اس کو تھا
نہ طاقت تھی تن میں کچھ جی میں تاب — نہ دل پاس نے صبر و آرام و خواب
سرِ راہ دل قیمہ قیمہ سیئے — یہ کہتا تھا مرجائیے بس جیئے
سن اس نو گلِ عشق کی بے کلی — رہا کرتی ماتم سرا وہ گلی
دل و صبر و ہوش و توان و حواس — رہیں اس کی وحشت سے سارے اُداس
نہ ناموس کا ننگ نے نام کا — مرا دوست دشمن تھا آرام کا
شب و روز فریاد کرنا اسے — کئی بار اک دم میں مرنا اسے
تماشے کا دیوانہ پیدا ہوا — زمانے کو چندے تماشا ہوا
جو دم بے طپش تو شتابی کرے — تسلیِ دل کی خرابی کرے
کرے طرح داغوں سے وہ باغ کو — روانی اسی سے زرِ داغ کو
دلِ غم زدہ سے محبت اسے — قیامت خوشی سے عداوت اسے
وہ بے تابیوں سے بہت کم فراغ — کہاں صبر کرنے کا اس کو دماغ

اُٹھی اس کے جی سے فغاں کی شرر	رہی برچھیاں سہتی آہِ سحر
نہ آنسو کو اس کے تھی اُس پر نظر	نہ آہِ سحر میں تھا اس کے اثر
کرے دیدۂ اشک افشاں پہ ناز	بدے بختِ دل رونے کی کچھ نیاز
سُنے نہ کسو کی نہ اپنی کہے	بیاں اس کا کچھ گو مگو ہی رہے
لے آ ساقی گر بادۂ شوق ہے	سیہ مستی کا ہم کو بھی ذوق ہے
کھلا چاہتا ہے گلِ رازِ عشق	کہ پردے میں کب تک بجے سازِ عشق
بڑی آتشِ عشق سرکش ہے یاں	جگر کیوں نہ جل جائے آتش ہے یاں
نظر آ کہیں جا رہا ہے یہ جی	کہ آنکھوں میں اب آ رہا ہے یہ جی
زن و مرد کی ہوں زباں سے بتنگ	ہوا ہوں میں سارے قبیلے کو ننگ
سدا خونِ دل میں طپیدہ ہوں میں	کہ آہِ بلب نارسیدہ ہوں میں
تری دوری میں پہنچی ہے ای حبیب	وداعِ دمِ واپسیں بھی قریب
جگر تو ہو پانی بہا غم کے بیچ	یہ دم بھی ہوا ہے کوئی دم کے بیچ
سمجھنا یہ بھی ای مرے سر پہ خاک	کس اُمید پر میں ہوا ہوں ہلاک
تو جب سے دراد پر نظر آگئی	رہیں آفتیں میرے سر پہ نئی
نہ نامہ نہ پیغام نے رسم و راہ	یونہیں ہوتی جاتی ہے حالت تباہ
دل و دیدہ سب مدعی ہو گئے	تماشائی مجھ پر بہت رو گئے
کئی بار جاں لب پر آ پھر گئی	کہاں ہے تو ای گل ہوا پھر گئی
یہ حیران ہوں صبر آتا نہیں	تصوّر ترا جی سے جاتا نہیں
خراشِ جگر سے ہے چھاتی میں درد	کہ جس سے ہوا جائے ہے رنگ زرد
رہا کرتی ہے داد بے داد یاں	دلِ شب سے گزری ہے فریاد یاں
سرِ رہ تک آ دیکھ یہ خستہ حال	کہ ہے نقشِ پا کی طرح پائمال

ترے دورِ غم میں تو جوں کیمیا — سُنا ہی کیا نامِ مہر و وفا
نہ آنا نظر اک ادا ہی ولیک — نہ اتنا کہ جاتا رہا جی سے ایک
ترے غم میں ای آفتِ روزگار — ہزاروں بلائیں ہیں یاں رو بکار
کہاں ہی تو محمل نشینِ حیا — سرِ راہ نالاں ہی میل و درا
کہاں ہی تو ای ساقیِ گلعذار — کہ دے مجھ کو جامِ مئے خوش گوار
لکھوں قصۂ عشقِ بے کیف و کم — قلم بے خودانہ کرے ہی رقم
مجھے آہ اک اس کے دل کی لگی — کہے تو کہ سینے میں برچھی لگی
گیا زہرۂ تابِ دل آب ہو — کہا آگے جا کر ہیں بیتاب ہو
کہ ای نازپروردہ مہرِ وفا — کوئی اپنے جی پر کرے ہی جفا
مثل ہی کہ جی ہی تو ہی گا جہان — وگرنہ موئے پر ہی کیا میری جان
تلف یوں نہیں جان کرتا کوئی — نہیں اس سلیقے سے مرتا کوئی
تہِ دل ہو معلوم تا بول ٹک — تو مژگانِ خوں بستہ کو کھول ٹک
سخن حسرت آلود کہنے پہ آ — کچھ اس دل کی باتیں زباں پر بھی لا
وگرنہ تو رُک رُک کے مر جائے گا — یہی عشق کام اپنا کر جائے گا
تو ہی صرصرِ عمر - آتش بجاں — دیا سا نہ بجھ جائیو ای جواں
ٹک اس شمعِ مجلس کو یہاں بلا — کہ جس مجلس افروز سے تو جلا
تو کس آتشِ تند پر ہی سپند — ترا دودِ دل یہ ہوا ہی بلند
جلاتی ہی آتش تری میرے تئیں — کیا داغ کس شعلے نے تیرے تئیں
گھٹا پاتے ہیں تجھ کو ہر صبح و شام — نہ کاہیدہ ہو تو ہی ماہِ تمام
ترا دردِ پنہاں ہی گو آشکار — یہ مجھ سے بیاں کر کہ ہوں راز دار
کہیں دل لگا ہو تو یہ مجھ سے کہہ — کہوں اس سے جا کر نہیں تو نہ رہ

جہاں کو تو بھیجے وہاں جاؤں میں
کہے کام جو تو بجا لاؤں میں

جو حورِ بہشتی بھی ہو تیری یار
کروں میں نمک کی طرح واں گذار

یہ سُن کر جوانِ ز خود رفتہ نے
جگر سوختہ اور دل تفتہ نے

کیا سوزِ دل کو لبوں پر نمود
زباں تاب[1] کھانے لگی جیسے دود

سخن ہونے لاگے نمودار کچھ
لگا کرنے پیچیدہ گفتار کچھ

کہ جس سے یہ معنی ہوے مستفاد[2]
کہ اے غم گسارِ دلِ نامراد

زبانی مری در پہ یہ جا کے کہہ
کہ احوال سے میرے غافل نہ رہ

ترے واسطے خوب رُسوا ہوا
مرے سر پہ ہنگامہ برپا ہوا

تسلّی شکیبائی مطلق نہیں
پر اب خوفِ تنہائی مطلق نہیں

رہی جب تلک تن میں تاب و تواں
اُٹھایا تحمل کا بارِ گراں

شتابی سے دے ساقیا جامِ عشق
کہ لکھنے لگا ہوں میں پیغامِ عشق

ہوا آخر[3] اب دل کا سب خونِ ناب
پیوں کب تلک ایک گلابی شراب

سراپا

سُن آواز دستک کی اک شتاب حور
مہِ چاردہ سے نپٹ باشعور

دو چار آکے مجھ سے ہوئی ایک بار
گیا جس کے دیکھے سے صبر و قرار

مژہ بخت عاشق کی برگشتگی
نگہ ایک عالم کی سرگشتگی

قد و قامت اس کا کروں کیا بیاں
قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں

وہ نازاں جدھر آتی تھی اچپلی
قیامت بھی آتی جلو میں چلی

میں سودائی اس زلفِ تاریک کا
ہر اک مو سبب رنجِ باریک کا

شکن اس کی کاکل کا دام بلا
ہر ایک حلقۂ زلف کامِ بلا

بھو دل کی کمانوں سے اگنے لفِ ناز
اُلٹتی تھی اُڑ اُڑ کے جوں تیر باز[4]

[1] پیچ [2] زائد لیا گیا۔ وجہ مفاد [3] ختم [4] باز گشت

اگر ابرو اس کی جھک جاتی تھی
مہِ نو کی گردن ڈھلک جاتی تھی

ہلیں اس کے ابرو جدھر کرکے ناز
کرے اس طرف ایک عالم نماز

کماں اس کے ابرو کی عاشق کمیں
خدنگ اس کی مژگاں کے سب دلنشیں

نہ آنکھوں کی مستی کی اس کو خبر
خرابی نہ عاشق کی مدِّ نظر

نگہدار تھی سرخیِ چشم کی
طرفدار تھی اپنے ہی خشم کی

شہید اس کی چشمک کے دل خستگاں
نشانے نگاہوں کے دل بستگاں

مژہ موجبِ قتلِ جمعِ کثیر
غرض سب تھے یہ ایک ترکش کے تیر

چھپیں اس کے غمزے میں کتنی سناں
نمایاں ہوئی سب پہ مرگِ جہاں

جبیں کھول دی اس پری زاد نے
کہ چیں مانی خوبانِ نوشاد نے

رواں اس شب افروز سے اشکِ شمع
یہیں سے ہے روشن کہ تھی رشکِ شمع

وہ مردوں کو زندہ دوبارا کرے
مسیحا جہاں سے کنارا کرے

پری منفعل رنگِ رخسار سے
خجل کبک اندازِ رفتار سے

خضر تشنہ اس کے ہی دیدار کا
مسیحا شہید اس کے بیمار کا

سوا اس کی باتوں کے سب باتیں ہیں
جسے سن کے مردے بھی جی جاتے ہیں

غرض اور سب یونہیں کہنے کو ہیں
مسیحا کے لب یونہیں کہنے کو ہیں

لبِ سرخ اس کے وہ گل برگِ تر
چھپیں جن میں دنداں کے سلکِ گہر

تبسّم میں اپنے وہ برقِ بہار
دمِ حرف ہوتے گئے آب دار

دہن غنچۂ ناشگفتہ سے کم
سخن رہروِ راہِ تنگِ عدم

تبسّم تنک کر وہ دلکش کرے
تو گلشن میں گل صد چمن غش کرے

نہ دیکھا کسی نے جو تن اس کا صاف
نظر گر نہ ٹھہرے تو کیجے معاف

کمر اس کی ممکن نہیں ہاتھ آئے
مگر صاحبِ دستِ غیب اس کو پائے

نہ رنگ صفا ہی فقط تن پہ تھا
کہ مینا کا خوں اس کی گردن پہ تھا

کیا ان نے پامال فتنوں کا خوں
حنا اس کے ہاتھوں میں کتنوں کا خوں

ادا اس کی عاشق کے جی کی بلا
نہ میری تمھاری سبھی کی بلا

اگر جلوہ گر ہو وہ محشر خرام
تو معلوم ہو یہ جہاں کا قیام

خراماں خراماں جدھر آ گئی
قیامت ہی گویا ادھر آ گئی

اسے لغزشِ پا سئے نازسے
وہ مستِ سرانداز انداز سے

نہ ہووے وہ دن جس میں ہووے نقاب
چلا جائے پردے ہی میں آفتاب

اسی بت کا ہر اک تئیں ذکر ہے
خدا کو خدائی کی اب فکر ہے

چڑھاوے اگر ہاتھ سے آستیں
تو پھر دست موسیٰ بھی کچھ ہی نہیں

ہوئیں طرح اس سے جفا کاریاں
نکالی ہیں ان نے دل آزاریاں

ترحم کو پاؤں تلے وہ ملے
ستم اس کے کوچے سے بچ کر چلے

جو آمد ہو اس کی نصیبِ چمن
کرے ترکِ گل عندلیبِ چمن

گلی اس کی فردوس کا تھی شرف
بہشت اک گنہگار سی اک طرف

زمیں اس کی یک دشتِ گلزار تھی
نسیمِ چمن واں گرفتار تھی

گلی اس کی وہ قتل گاہِ عجیب
شہادت جہاں خضر کو ہو نصیب

وہی جائے باشِ دلِ عاشقاں
اسی پر معاشِ دلِ عاشقاں

صبا گر اڑا دے تنک واں کی خاک
تو نکلے زمیں سے دلِ چاک چاک

کئی نعرہ کش واں گئے نعرہ زن
کئی خوں گرفتہ گئے بے کفن

کئی بے وطن واں سفر کر گئے
سسکتے ہیں کتنے کئی مر گئے

ہر اک جان ہر شخص ناکام کی
ہر ادا راس کے لبِ بام کی

پھروں گرد ساقی نشے میں ترے
گلابی ہی منہ کو لگا دے مرے

۵۱ قایم - بنیادی قایمی -

مجھے مست آب سیہ دے کے کر
چلوں جوں قلم پھر بھی مطلب اوپر

سنا وہ جگر سوز پیغام جب
کیے آشنا حرف سے لعل لب

کہ ہجراں میں جو بے قراری کرے
بہر راہ فریاد و زاری کرے

نہ سونے دے نالوں سے ہمسایہ کو
بھلی مرگ ایسے فرومایہ کو

محبت کی رہ میں وہ پھیلائے گام
کہ سر سے گذر جائے جو شادکام

نہیں شرط الفت میں چین جبیں
اگر پیش آوے دم واپسیں

جو پھوٹا ہی پڑتا ہو جوں آبلہ
وہ ہو غم میں واماندۂ قافلہ

نہ جو ہوسکے ہجر کا پائمال
تو بہتر ہی ہوتا ہے اس کا وصال

گیا ہیں جواب اس سے لیکر ادھر
سر رہ تھا پامالِ غم وہ جدھر

حقیقت بیاں کی سب اس جائے کی
جواں نے یہ سنتے ہی اک ہائے کی

گئی ساتھ اس ہائے کے اس کی جاں
گرا خاک پر ہوکے بے دم جواں

تکے تھا اگر رہ سفر کر گیا
کہ اک بات کی بات میں مر گیا

مری بات میں خونِ بلبل ہوا
دیا سا وہ جلتا جو تھا گل ہوا

پلا ساقیٔ ماہ وش ایک جام
گیا کاستن[2] ہی میں ماہ تمام

کہاں ہے وہ خونِ کبوتر سی مے
کہ پی کر فغاں کیجیے مثل نے

یہ بھی جائے گر یہ ہے ساقی سنا
کہ بارے گزک کے بھی ہے دل بھنا

تھوڑی دارو دے سایۂ تاک میں
برنگِ گل اب لوٹیے خاک میں

مقولہ

عجب کچھ نہیں جا نہ کھا پیچ و تاب
یہ میر اب جو ہے عشق خانہ خراب

سنا ہے کہ فرہاد پر کیا ہوا
پر اس عشق نے شیریں سے کیا کیا

عزا کا ہے مجنوں کی نوحہ پڑا
سیہ خیمہ لیلےٰ کا بھی ہے کھڑا

---

[1] سر دیدے۔ جیسے جی سے گزرنا یعنی جان دے دینا۔ [2] گھٹنا گھنا

گئی جان وامق کی کس رنگ سے
ہوا خاک عذرا کا سر سنگ سے

گئی آہ نل کی فلک سے ادھر
دمن سے بگولا زمیں کے اوپر

بہت عشق کی آگ میں جل گئے
بہت اُٹھتے جاتے ہیں شعلے سنے

گئی جل کے آخر پتنگوں کی جان
چراغوں سے اک دود دل ہے کشاں

ہے بیتاب ذرہ اسی سے کباب
جلے ہے اسی آگ میں آفتاب

دل اس داغ سے مہ کا بجھتا ہی ہے
کتاں کا جگر چاک سنتا ہی ہے

سیہ رنگ اُگتا ہے سرو سہی
وہی رنگ قمری ہے خاکستری

بھنور کے بھی جی پر پڑی کھلبلی
کنول کی کھلی آنکھ پر مند گئی

کوئی نالہ بلبل سے ہے یادگار
خزاں اس چمن میں ہے گل کی بہار

کہیں ساقی دے آبِ گلرنگ کو
کشادہ بھی کر اس دلِ تنگ کو

گلے لگ کے مینا کے ٹک رویئے
فسانہ بھی آخر ہوا اب سوئیے

شعلۂ عشق

(۲)

محبّت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور	نہ ہوتی محبّت نہ ہوتا ظہور
محبّت ہے علّت محبّت سبب	محبّت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبّت بن اس جا نہ آیا کوئی	محبّت سے خالی نہ پایا کوئی
محبّت ہی اس کارخانے میں ہے	محبّت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبّت سے سب کو ہوا ہے فراغ	محبّت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ
محبّت اگر کارپرداز ہو	دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو
محبّت ہی آبِ رُخِ کارِ دل	محبّت ہے گرمیِ آزارِ دل
محبّت عجب خوب خونریز ہے	محبّت بلائے دل آویز ہے
محبّت کی ہیں کارپردازیاں	کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں
محبّت کی آتش سے اخگر ہے دل	محبّت نہ ہووے تو پتھر ہے دل
محبّت کو ہے اس گلستاں میں راہ	کلی کے دلِ تنگ میں بھی ہے جاہ
محبّت ہی سے دل کو رو بیٹھیے	محبّت میں جی مفت کھو بیٹھیے
محبّت لگاتی ہے پانی میں آگ	محبّت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ
محبّت سے ہے انتظامِ جہاں	محبّت سے گردش میں ہے آسماں
محبّت سے روتے گئے یار خوں	محبّت سے ہو ہو گیا ہے جنوں
محبّت سے آتا ہے جو کچھ کہو	محبّت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو
محبّت سے پروانہ آتش بجاں	محبّت سے بلبل ہے گرمِ فغاں
اسی آگ سے شمع کو ہے گداز	اسی کے لیے گل ہے سرگرمِ ناز

محبت سے ہی تحت سے تا بفوق
زمیں آسماں سب ہیں لبریز شوق

محبت سے یاروں کے ہیں رنگ زرد
دلوں میں محبت سے اٹھتے ہیں درد

گیا قیس ناشاد اس عشق میں
گئی جان فرہاد اس عشق میں

ہوئی اس سے شیریں کی حالت تباہ
کیا اس سے لیلیٰ نے خیمہ سیاہ

سنا ہوگا وامق پہ جو کچھ ہوا
نل اس عشق میں کس طرح سے موا

جو عذرا پہ گذرا سو مذکور ہے
دمن کا بھی احوال مشہور ہے

ستم اس بلا کے ہی سہتے گئے
سب اس عشق کو عشق کہتے گئے

اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں
یہی ذرّے کی جان نومید میں

اسی سے دل ماہ ہے داغدار
کتاں کا جگر ہے سراسر فگار

سنے اس کے چرچے حکایت سنی
گہے شکر گاہے شکایت سنی

اسی سے قیامت ہے ہر چار اور
اسی فتنہ گر کا ہے عالم میں شور

کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں
نہ ہو اس سے آشوب محشر عیاں

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی
کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار
غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار

آغاز قصہ

عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا
عجب اہل عالم کو جس سے ہوا

کہ واں اک جواں تھا پرسرام نام
خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام

جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ
گلستاں پہ کام اس کی خوبی سے تنگ

جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ
چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ

کھلے بال چلتا تھا وہ سرو ناز
قدم بوس کو آتی عمر دراز

جدھر کو وہ ٹک گرم رفتار ہو
قیامت ادھر سے نمودار ہو

نگہ گرم اُس کی جدھر جا لڑی
کہے تو کہ اُودھر کو بجلی گری

وہ کافر بھویں ہوویں مائل جہاں
کریں سجدہ اس جا پہ اسلامیاں

نگہ تیغ مجروح جس کی پڑے
پلک سیل چوں دل میں جاکر گڑے

سیہ چشم اُس کی وہ بدمست تھی
نگاہوں سے شمشیر در دست تھی

رُخ اُس کا کہاں اور مہ و خور کہاں
تفاوت زمیں آسماں کا ہے یاں

وہ لب لعل کو جن سے شرمندگی
دمِ حرف سرمایۂ زندگی

دہن کی جو تنگی نظر کیجیے
تو آگے سخن مختصر کیجیے

نہ ہم تم زنخ دیکھ حیراں ہیں
سبھی دست زیر زنخداں رہیں

سراپا ہیں اس کے جہاں دیکھیے
وہیں روئے مقصودِ جاں دیکھیے

خراماں نکلتا وہ جس راہ سے
قیامت تھی واں نالہ و آہ سے

فدا اُس پہ جی جان ہر ایک کا
کہ مقصودِ دل تھا بد و نیک کا

کئی گرد و پیش اُس کے وارفتگاں
کئی ایدھر اودھر جگر تفتگاں

بہت رفتگانِ ادائے کلام
بہت مبتلائے بلائے خرام

کوئی کشتہ تھا شوقِ رفتار کا
کوئی نیم جاں ذوقِ دیدار کا

کوئی والۂ خندۂ برق وش
کسی کے تئیں جنبش لب سے غش

کسو کی نظر میں کمر کی لچک
کسو کے جگر میں پلک کی کسک

کئی حیرتی طرزِ گفتار کے
کئی آرزو کش تھے پیکار کے

کوئی زلف سے اس کی مجنوں رہے
کسو کا تبسم سے دل خوں رہے

کوئی دل ستم کشتۂ یک نگاہ
کوئی جان ہونٹوں پہ موقوفِ آہ

کسو پر فسوں گردشِ چشم کا
کسو پر غضب غمزہ و خشم کا

انھوں میں سے اک عاشقِ زار تھا
اس آفت سے اس کو سروکار تھا

کئی دن میں جاکر جو اُس سے ملا　　کیا اُس نے حد سے زیادہ گلا
کہ ای نازنیں آہ کن نے کہا　　کہ تو حال سے میرے غافل رہا
مگر سدّ رہ تھا کسو کا فریب　　ملا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب
کوئی زلف زنجیرِ پا ہو گئی　　کہ مسدود راہِ وفا ہو گئی
طرح کس کی چتون کی دل میں کھُبی　　جگر میں پلک شوخ کس کی چھبی
کسی چشم نے تجھکو جادو کیا　　مرے جامِ عشرت کو لوہو کیا
کہا اُن نے تھی کد خدائی مری　　نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری
نہ فرصت مجھے صبح ہی اب نہ شام　　طرف اُس کے ہی دل کو میلِ تمام
اُسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہی　　دلوں کو بہم رابطہ خاص ہی
اُسے مجھ سے ہی نسبتِ عاشقی　　وہ رہتی ہی بے طاقتِ عاشقی
نہیں اُس کو یک لحظہ تابِ فراق　　جدائی مری اُس پہ گزرے ہی شاق
نکلتا ہوں گھر سے جو میں ایک آن　　تو پاتا ہوں جاکر اُسے نیم جان
نہ دیکھے جو مجھ کو تو مرجائے وہ　　وہیں جی سے اپنے گزر جائے وہ
جو پہونچے مری جھوٹ اُسے بدخبر　　تو کر بیٹھے سچ اپنے جی کا ضرر
غرض اُس کو تاب و تحمل نہیں　　شکیبائی ہجر بالکل نہیں
یہ سُن کر کہا اُس دل افگار نے　　ستم کُشتۂ دورئ یار نے
کہ مجھ کو نہیں تیری باتیں قبول　　یہ مکرِ زناں ہیں تو ان پر نہ بھول
وفا کننے ان ناقصوں میں سے کی　　ہوا شوے کس کا کہ وہ پھر نہ جی
بہ ظاہر ہیں ہرچند ہوں رشکِ ماہ　　ولیکن ہیں باطن میں مارِ سیاہ
خدا مکر سے ان کے دے ہی خبر　　نہیں اُن سے کوئی فریبندہ تر
جہاں میں فریب ان کا مشہور ہی　　زبانوں پہ مکر ان کا مذکور ہی

ملہ برسام۔

پئے امتحاں عاقبت یک نفر
مقرر ہوا تا کہ جاوے اُس کے گھر

کہے غرقِ دریا ہوا پرسرام
ہوئی زندگانی کی صبح اس کی شام

گیا تھا نہانے کو وقتِ سحر
سو ڈوبا وہ خورشیدِ روشن گہر

گیا موجِ دریا نے سر سے گزار
اُٹھا طبعِ نازک سے اس کے غبار

وہ گیسو جو بکھرے تھے بالائے آب
سو اب موجِ دریا کو ہے پیچ و تاب

پھریں تھیں جو وے انکھڑیاں آب میں
سو وے گردشیں اب ہیں گرداب میں

تمنا میں تھے جس کی سب دل فگار
سو دریا کو اب ہے وہ بوس و کنار

نہ سمجھا وہ نافہم[1] اسرارِ عشق
نہ سوچا وہ ناتجربہ کارِ عشق

کہا غرقِ دریا ہوا پرسرام
ہوا کام اس رشکِ مہ کا تمام

کہے تو کہ موجوں کو تھا انتظار
کہ دست و بغل ہو گئیں ایک بار

گیا بیٹھ پانی میں ایسا شتاب
کہ گویا لبِ آب کا تھا حباب

کنارے پہ دریا کے اک شور ہے
بحالِ تباہ ایک جمہور ہے

کوئی سر پر اس غم سے ڈالے ہے خاک
کسی نے کیا ہے گریبان چاک

سُنا اُس کے ہمسر نے جب یہ سخن
ہوا موجزن بحرِ رنج و محن

گری ہو کے بے جاں وہ دردمند[2]
ہوا شور نوحے کا گھر سے بلند

وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا
کہ اس واقعے سے پشیماں گیا

خبر لے گیا اُس کنے زود تر
جو تھا درپئے امتحاں بے خبر

گیا ہوش سُن کر پرسرام کا
دوانہ ہوا عشق کے کام کا

اُٹھا بے خود و بے خرد بے حواس
گرا آکے اس پیکرِ مردہ پاس

لگا کہنے اے مایۂ زندگی
مجھے منہ سے تیرے ہے شرمندگی

کیا جلد رختِ سفر تو نے بار
نہ میرا کیا آہ ٹک انتظار

[1] پیغامبر جو یہ خبر لیکر گیا۔ [2] پرسرام کی زوجہ

نہ میری سنی کچھ نہ اپنی کہی
مرے تیرے دونوں کے جی میں رہی

زمیں پر سے آخر اٹھایا اُسے
لب آب جا کر جلایا اُسے

جب آگ اس کے پیکر پہ سب چھا گئی
محبت عجب داغ دکھلا گئی

بہ سر گرم فریاد و زاری ہوا
لہو اس کی آنکھوں سے جاری ہوا

جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا
رکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا

گئے ہوش و صبر اس کے یکبارگی
طبیعت میں آئی اک آوارگی

سراسیمگی سے بگولا ہوا
پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا

نہ جی کو تسلی نہ دل کو قرار
کف غم میں سر رشتۂ اختیار

کبھو یاد کر اُس کو نالاں رہے
کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے

کبھو یاں کبھو واں بحال خراب
وہی بے قراری وہی اضطراب

رہے گھر تو آشوب گہ وہ گلی
چمن میں جو لے جائیں تو بیکلی

کبھو متصل ہونٹھ پر آہ سرد
کبھو دست بر دل کہ دل میں ہے درد

ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد
لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد

کچھ اپنے بد و نیک کی سدھ نہیں
نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

کبھو جا کے صحرا سے لاویں اُسے
کبھو روتے دریا پہ پاویں اُسے

کبھو خاک ملتا ہے منھ پر کھڑا
کہیں ہے خرابی میں بے سدھ پڑا

کنارے پہ رہتا تھا اک دام دار
رہا رات اُس کے یہ قرب و جوار

کہا اُس کی عورت نے اُس رات کو
نہیں تجھ سے جی چاہتا بات کو

تجھے فکر کچھ اب ہماری نہیں
تو جاتا نہیں شام سے اب کہیں

ترا شب کو دریا میں پڑتا تھا دام
تو چلتا تھا بارے معیشت کا کام

وہ بولا کہ میں بھی پریشان ہوں
بہت تنگ دستی سے حیران ہوں

کہ یک شعلۂ تند پرپیچ و تاب
فلک سے اُترتا ہے نزدیکِ آب

ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں
کہے ہے "پرسرام تو ہے کہاں"

سُنا حال شعلے کا صیاد سے
دھواں اک اُٹھا جانِ ناشاد سے

کیا[۵۳] عقل کی اُن نے باتیں جو واں
وہ عاشق جو تھا درپئے امتحاں

لگا کہنے یہ آرزو تھی سب مجھے
کہ اک روز ہشیار دیکھوں تجھے

مقرر کیا ہے کئی دن سے یہ
کہ آئندہ رہیے تری خاکِ رہ

جو اس میں ہے خوشتر تو ہوں میں بھی تا
رہیں گے لبِ آب ہی آج رات

ہوئے عاقبت ہوئے دریا رواں
نہ پیدا کسو پر یہ رازِ نہاں

ہوئے ناؤ پر شام کو جب سوار
کہا ان نے یاں ایک ہے دام دار

اسے سات لو تو بڑی بات ہے
کہ دریا میں پھرتا ہے اور رات ہے

لیا آخرالامر ہمرہ اُسے
بٹھا یا قریب اپنے یہ کہہ اُسے

کہاں شعلۂ سرکش آتا ہے یاں
کدھر پیچ و تاب آکے کھاتا ہے یاں

یہ صیاد سے تھا ہی محوِ سراغ
جگر آتشِ شوق رکھتی تھی داغ

کہ ہو کر فروغ اک سوئے آسماں
تڑپنے لگا جیسے آتش بجاں

پکارا "کہاں ہے پرسرام تو
محبّت کا ٹک دیکھ انجام تو

کہ میں جملہ تن آتش تیز ہوں
دل گرم سے شعلہ انگیز ہوں

بھڑکتی ہے جب آگ دل کی مرے
لب آب اُتروں ہوں غم میں ترے

مگر سوزشِ دل ہو کم آب سے
نہ سمجھے جی مرا اس تپ و تاب سے

سو یہ آب رکھتا ہے روغن کا کام
کیا عشق نے آہ دشمن کا کام"

یہ بیتاب سن کر ہوا بے قرار
سفینے سے اُترا بصد اضطرار

ہوا ہمدم اس آتش انگیز سے
کہا اُس بلا سے دل آویز سے

[۵۳] یعنی پرسرام نے اس واقعہ کے بعد جب ہوش حواس کی باتیں کیں (کیا ان نے گویا) ... درپئے امتحاں: امتحان دینے کی کوشش میں تھا۔

کہیں ہوں پر سرام خانہ خراب   مرا دل بھی اس آگ سے ہی کباب
مرے بھی جگر میں یہی سوز ہی   یہی مجھ کو جلنا شب و روز ہی
محبّت تری برقِ خرمن ہوئی   تری دشمنی جی کی دشمن ہوئی
سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا   کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل جلا
بہم گرمجوشی سے یک جا ہوئے   کہ گزری تھی مدت بھی تنہا ہوئے
وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل   کہے تو تسلّی ہوئے جانِ و دل
یکایک بھڑک کر وہ جلنے لگا   پھرا ادھر اودھر پھرنے چلنے لگا
کیا پاس پانی کے آکر صعود   رہی روشنی سے کوئی دم نمود
پھر آگے کسو پر نہ پیدا ہوا   نہ جانا کہ وہ شعلہ پھر کیا ہوا
اُٹھے ڈھونڈنے ہو کے سب ناصبور   کنارے پہ دریا کے نزدیک دور
نہ پایا کہیں اس کو حیراں ہوئے   نہایت ہی خاطر پریشاں ہوئے
محبّت نے ایسا کھپایا اُسے   کہ ہرگز کنھوں نے نہ پایا اُسے
پھرے خوار ہو ہو کے ناچار سب   کسی کو تحیر کسی کو عجب
کوئی منفعل ساتھ آنے سے تھا   کوئی برلبِ آب جلنے سے تھا

مقولہ شاعر

اگر ہی یہ قصہ بھی حیرت فزا   ولے میر یہ عشق ہی بد بلا
بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے   بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے
فسانوں سے اس کے لبالب ہی دہر   جلائے ہیں اس تند آتش نے شہر

محبّت نہ ہو کاش مخلوق کو
نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

دریائے عشق

(۳)

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

دل میں جاکر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہوکے بہا
کہیں سر میں جنون ہوکے رہا

کہیں رونا ہوا ندامت کا
کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

گہہ نمک اس کو داغ کا پایا
گہہ پتنگا چراغ کا پایا

واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ
یاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ

کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے
کہیں یہ خونچکاں شکایت ہے

تھا کسی دل میں نالۂ جاں کاہ
ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ

تھا کسو کی پلک کی نمناکی
ہے کسو خاطروں کی غمناکی

کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا
کہیں موجب شکستہ رنگی کا

کہیں اندوہِ جان آگہ تھا
سوزشِ سینہ ایک جاگہ تھا

کہیں عشاق کی نیاز ہوا
کہیں اندوہِ جاں گداز ہوا

ہے کہیں دل جگر کی بے تابی
تھا کسو مضطرب کی بے خوابی

کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا
کسو محمل کے آگے گرد ہوا

طور پر جاکے شعلہ پیشہ رہا
بے ستوں میں شرارِ تیشہ رہا

کہیں بے بست[۵۱] کو لگائی آگ
کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ

کبھو افغانِ[۵۲] مرغِ گلشن تھا
کبھو قمری کا طوقِ گردن تھا

کسو مسلخ[۵۳] میں جا فنارہ[۵۴] ہوا
کوئی دل ہوکے پارہ پارہ ہوا

۵۱ بست: پے جبر ظلم ۵۲ فغان ۵۳ مذبح ۵۴ رسی یا میخ جس میں قصاب ذبح کیے ہوئے جانور کو ٹانگتے ہیں۔

ایک عالم میں دردمندی کی
ایک محفل میں جا پسندی کی

ایک دل سے اُٹھے ہی ہو کر دود
ایک لب پر سخن ہی خوں آلود

اک زمانے میں دل کی خواہش تھا
ایک سینے میں جگر کی کاہش تھا

کہیں بیٹھے ہی جی میں ہو کر چاہ
کہیں رہتا ہی قتل تک ہمراہ

خار خارِ دلِ غریباں ہی
انتظارِ بلا نصیباں ہی

کہیں شیون ہی اہلِ ماتم کا
کہیں نوحہ ہی جانِ پر غم کا

آرزو تھا اُمید واروں کی
دردمندی جگر فگاروں کی

نمکِ زخمِ سینہ ریشاں ہی
نگہِ نازِ زہر کیشاں ہی

حسرت آلودہ آہ تھا یہ کہیں
شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں

کشش اس کی ہی ایک عجوبہ
ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا

کون محرومِ وصل یاں سے گیا
کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا

کام میں اپنے عشق یکتا ہی
ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہی

جس کو ہو اس کی التفات نصیب
ہی وہ مہمانِ چند روزہ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہی
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہی

قصہ

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا
لالہ رخسار سرو بالا تھا

عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم
دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم

شوق تھا اس کو صورتِ خوش سے
اُنس رکھتا تھا وضعِ دلکش سے

تھا طرحدار آپ بھی لیکن
رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

کوئی ترکیب اگر نظر آتی
صورتِ حال اور ہو جاتی

دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار
رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار

زلف ہوتی کسو کی گر برہم / دیکھتے ہیں کسے حال کو درہم
دیکھتا گر کہیں وہ چشمِ سیاہ / دل سے بے اختیار کرتا آہ
سر میں تھا شوق شوق دل میں تھا / عشق ہی اس کے آب و گل میں تھا
الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب / ناشکیبا رہے تھا بے محبوب
ایک دن بے کلی سے گھبرایا / سیر کرنے کو باغ میں آیا
کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا / کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا
اِک خیابان میں سے ہو نکلا / ایک سائے تلے سے رو نکلا
نہ تسلی ہوا دلِ بے تاب / نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب
دل کی واشد سے بے توقع ہو / ہر شجر کے تلے بہت سا رو
دیکھ گلشن کو نا امیدانہ / منہ کیا اُن نے جانبِ خانہ
دل کے رکنے کا اُس کو اک غم تھا / راہ چلنے میں حال درہم تھا
ناگہ اک کوچہ سے گزار ہوا / آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفے سے ایک مہ پارا / تھی طرف اُس کے گرمِ نظارہ
پڑ گئی اُس پہ اک نظر اُس کی / پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی / وہ نظر بھی وداعِ طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ / صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کج ادائی کی / تاب و طاقت نے بے وفائی کی
مُنہ جو اُس کا طرف سے اس کے پھرا / مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا
وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اس کا / بے طرح ہووے گو کہ حال اس کا
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ / اُٹھ گئی سامنے سے یک بارہ
وہ گئی اس کے سر بلا آئی / خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک

طبع نے اک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا

سوزشِ دل نے جی میں جا گہ کی
داغ نے آ جگر کو آتش دی

بسترِ خاک پر گرا وہ زار
درد کا گھر ہوا دلِ بیمار

خاطرِ اُفگار خار خار ہوئی
جان تمنا کشِ نگار ہوئی

اُس[1] کے منھ پر پڑی جو اُس[2] کی نگاہ
نا اُمیدی کے ساتھ سرکی آہ

خود ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ
رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ

ہونٹھ سوکھے تو خونِ ناب ملا
خواب و خور دونوں کو جواب ملا

خلق اس کی ہوئی تماشائی
پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی

کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے
رو دیا اُن نے ایک حسرت سے

جا کے اُس کے قریب در بیٹھا
قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا

دل نے مجبورِ اضطراب کیا
شوق نے کام کو خراب کیا

جو کہ سمجھے تھے اُس کو دیوانہ
رحم کرتے تھے آشنا یا نہ

عاشق اُس کو کسو کا جان گئے
سب بُرا اس ادا سے مان گئے

وارث اُس کے بھی بدگمان ہوئے
درپئے دشمنیِ جان ہوئے

پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام
سُن کے آخر کہیں گے خاص و عام

کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا
کن نے مارا اُسے کہاں مارا

دے کے دیوانہ اُس جواں کو قرار
ہو گئے سارے درپئے آزار

ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا
ایک نے آ کے زیرِ سنگ کیا

ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر
ایک بولا کہ اب ہی کیا تاخیر

[1] عاشق کی - [2] محبوبہ کی۔

کی اشارت کہ کودکانِ شہر
آئے لبریز غصہ و پر قہر

گرچہ ہنگامہ اُس کے سر پر تھا
لیک روے دل اُس کا اودھر تھا

محو تھا اُس کے یہ خیال کے بیچ
تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ

ہونٹھ پر حسن کا بیاں اُس کا
تھا سر و سنگ آستاں اُس کا

ایک دم آہ سرد بھر اُٹھنا
نالۂ گرم گاہ کر اُٹھنا

جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے
اس طرف یک نگاہ مشکل ہے

دوست کو میرے نام سے ہے ننگ
دشمنوں سے ہے جی پہ عرصۂ تنگ

چشم ترسے لہو بہا کرتا
صبح کی باد سے کہا کرتا

کا ہے نسیم سحر یہ اُس سے کہہ
مت تغافل کر اور غافل رہ

ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیئے
جان پر آبنی ہے تیرے لیئے

جان و دل تیرے واسطے سو تو
آنکھ اُٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی
دور پہونچی ہے میری رسوائی

نام کو بھی ترے نہ جانا آہ
تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ

نا اُمیدانہ گر کروں ہوں نگاہ
دیکھتا ہوں ہزار روزِ سیاہ

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد
ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد

کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق
بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق

نالہ ہوتا ہے گہہ گہے دل جو
گریہ آنسو سے پونچھتا ہے کبھو

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

چشم رکھتا ہے وصل کی پہ دل
جی ہے اس سے اسیر آب و گل

ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی
صورت اک معنیٔ نہاں ہوتی

اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات
ایک میں اور کتنے تصدیعات

سنگِ باراں سے سخت ہیں وہ اننگ
شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ

مجرمِ یک نگاہ بیش نہیں
کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں

کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ
اک قیامت بپا ہے یاں سرِ راہ

کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز
اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز

بس تغافل ہوا ترحم کر
گوشِ دل جانبِ تظلم کر

کون کہتا ہے رہ نہ مجھ نا ز
پر نہ اتنا کہ جی سے جاے نیاز

جب ہوا ذکرِ اقل و اکثر میں
چاہ ثابت ہوئی اسی گھر میں

سب محافے میں اس کو کر کے سوار
ساتھ دی ایک دایۂ غدار

پار دریا کے جلد رخصت کی
اس طرح فکرِ رفعِ تہمت کی

گھر سے باہر محافہ جب نکلا
اس جواں پاس ہو کے تب نکلا

طپشِ دل سے ہو کے یہ آگاہ
ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ

قطرہ زن اشک سا وہ راہ تمام
در پئے راہ تھا یہ بے آرام

ہر قدم تھا زبان پر جاری
خواب ہے یہ کہ ہے یہ بیداری

ہمسری اس کی تھی میسّر کب
ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب

شوقِ مفرط نے بے رہی کی سخت
تو شکیبی نے دل سے باندھا رخت

رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے
اڑنے لاگے جگر کے پرکالے

اضطرابِ دلی نے زور کیا
ان نے بے اختیار شور کیا

دل کے غم کو زبان پر لایا
آفتِ تازہ جان پر لایا

کاے جفا پیشہ و تغافل کیش
اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش

منھ چھپایا ہے تو نے اس پر بھی
نگہِ التفات ایدھر بھی

صبر کس کس بلا سے کر گزروں
چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں

منزلِ وصل دور ہیں کم پا[51]
تجھ کو اس مرتبے ہیں استغنا

ہے تو نزدیک دل سے اے طناز
لیک تجھ تک سفر ہے دور و دراز

ناز نے یک نفس نہ رخصت دی
آئینے نے تجھے نہ فرصت دی

تو تو واں زلف کو بنایا کی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھ کو تھی اپنے خال رخ پہ نگاہ
دل مرا مبتلائے داغ سیاہ

تجھ کو مدِ نظر تھی اپنی چال
میں ستمکش ہوا کیا پامال

بسترِ خواب پر تجھے آرام
مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے ہے کام

واں لبِ لعل تیرے خنداں تھے
یاں فسردہ جگر پہ دنداں تھے

ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے
رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر
حال پر میرے ٹک تأسف کر

آب کیسا کہ بحر تھا زخار
تند و موّاج و تیرہ و تہ دار[52]

موج کا ہر کنارہ طوفاں پر
مارے چشمک حبابِ عماں پر

ہمکنارِ بلا ہر اک گرداب
لجہ سرمایہ بخشِ تیرہ سحاب

گزرِ موج جب نہ تب دیکھا
ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا

کشتی اک آن کر ہوئی موجود
ہو فلک سے ہلال جیسے نمود

کی کنارے پہ لا کے استادہ
تھا محافہ رکوب آمادہ

اس سفینے میں جلد جا پہونچا
یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا

بیچ دریا کے دایہ نے جا کر
کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر

پھینکی پانی کی سطح پر یکبار
اور بولی کہ اے جگر افگار

حیف تیری نگار کی پاپوش
موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش

غیرتِ عشق ہے تو لا اس کو
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اس کو

[51] کوتاہ قدم۔ کم چلنے والا۔ [52] بہت گہرا

سن کے یہ حرفِ دایۂ مکّار / دل سے اس کے گیا شکیب و قرار
بے خبر کارِ عشق کی تہ سے / جست کی اُن نے اپنی جاگہ سے
تھا سفینے میں یا کہ دریا میں / موجِ زنجیر ہو گئی پا میں
کھچ گیا قعر کو یہ گوہرِ ناب / تھی کششِ عشق کی مگر تہِ آب
کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں / ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں
ڈوبے جو یاں کہیں وہ جا نکلے / غرقِ دریائے عشق کیا نکلے
عشق نے آہ کھو دیا اس کو / آخر آخر ڈبو دیا اس کو
دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد / واں سے کشتی چلی برنگِ باد
یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے / فتنہ سازی میں اک قیامت ہے
خاک ہو کیوں نہ عاشقِ بیدل / کام سے اپنے یہ نہیں غافل
وصل جیتے نہ ہو میسّر اگر / لاوے معشوق کو یہ تربت پر
یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد / خاکِ خوباں بھی ان نے کی برباد
قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ / آئی وہ رشکِ مہ زخود رفتہ
کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ / ہو گیا غرق وہ فرومایہ
اب تو وہ ننگ[1] درمیاں سے گیا / آرزومند اس جہاں سے گیا
تھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد / ساتھ اُس کے گئے وہ شور و فساد
شور و فتنے تھے اُس تلک سارے / اب تو بدنامیاں نہیں بارے
دل تڑپتا ہے متصل میرا / مرغِ بسمل ہے یا کہ دل میرا
وحشتِ طبع اب تو افزوں ہے / حال جی کا مرے دگرگوں ہے
بے دماغی کمال ہوتی ہے / جانِ تن کی وبال ہوتی ہے
دل کوئی دم کو خون ہووے گا / آج کل میں جنون ہووے گا

[1] عاجز ہوکر

بے کلی جی کو تاب دیتی ہے ۔ طاقتِ دل جواب دیتی ہے

جی میں آتا ہے ہوں بیابانی ۔ پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی

مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر ۔ ایک دو دم رہیں گے دریا پر

گاہ باشد کہ دل مرادا ہو ۔ ورنہ کیا جانیے کہ پھر کیا ہو

یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق ۔ گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق

جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے ۔ عاقبت اس کو مار رکھتا ہے

جذب سے اپنے جب کرے ہے کام ۔ عاشق مردہ سے بھی لے ہے کام

صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید ۔ اس جگہ سے رواں ہوئی نومید

پہونچی نصف النہار دریا پر ۔ روئی بے اختیار دریا پر

حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی ۔ دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ ۔ یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ

مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل ۔ لیک تہ سے سخن کی تھی غافل

یہ نہ سمجھی کہ ہے فریبِ عشق ۔ ہے یہ مہ پارہ ناشکیبِ عشق

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف ۔ یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکر ۔ گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کر کر

موج ہر ایک کمندِ شوق تھی آہ ۔ لپٹی اس کو برنگِ مارِ سیاہ

دام گستر وہ عشق تھا تہِ آب ۔ جس کے حلقے تمام تھے گرداب

حسن موجوں میں یوں نظر آوے ۔ نورِ مہتاب جس سے لہراوے

تھیں وہ اس کی حنائی انگشتاں ۔ غیرت افزائے پنجۂ مرجاں

سر پہ جس دم وہ آب ہو کے بہا ۔ سطحِ پانی کا آئینہ سا رہا

کششِ عشق آخر اس مہ کو ۔ لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو

کودے غواص و آشنا سارے
تا بمقدور دست و پا مارے

کھینچ کے کوفت سب ہوئے بیتاب
نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب

جا بہم آغوش مردہ یار ہوئی
تہ میں دریا کے ہم کنار ہوئی

پاک کی زندگی کی آلایش
ہو کے دست و بغل کی آسایش

نکلے باہر ولے موئے نکلے
دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

ربطِ چسپاں بہم ہو یدا تھا
مرگئے پر بھی شوق پیدا تھا

ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں[1]
ایک کے لب سے ایک کو تسکیں

جو نظر ان کو آن کرتے تھے
ایک قالب گمان کرتے تھے

کیا لکھوں مل رہے وہ وصلی وار
ہاں گر سے جدا ہوئے دشوار

کیوں نہ دُشوار ہوئے ان کا فصل
جان دے دے ہوا ہو جن کا وصل

حیرتِ کارِ عشق سے مردم
شکلِ تصویر آپ میں تھے گم

مقولہ

میر اب شاعری کو کر موقوف
عشق ہی ایک فتنۂ معروف

قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہی
اسے جو تو کہے سو آتا ہی

کتنی وسعت ترے بیاں میں ہی
کتنی طاقت تری زباں میں ہی

لب پہ اب مہر خامشی بہتر
یاں سخن کی فرامشی بہتر

[1] زیرِ سر

جوش عشق

(۴)

ضبط کروں میں کب تک آہ اب — چل اے خامے بسم اللہ اب
کر ٹک دل کا رازِ نہانی — ثبتِ جریدہ میری زبانی
یعنی میرؔ ایک خستۂ غم تھا — سرتاپا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جاگہ — بیخود ہو گئی جانِ آگہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت — تاب نے ڈھونڈی ایک دم فرصت
تاب و توان و شکیب و تحمل — رخصت اس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی — بیتابی نے طاقت پائی
گھرتے آئے داغِ سیاہی — کام جگر کا کرنے تباہی
خونِ جگر ہو بہنے لاگا — پلکوں ہی پر رہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا — ایک گھڑی آرام نہ آیا
چاکِ جگر سے محبت ٹپکی — آنسو کی جاگہ حسرت ٹپکی
سوز سے چھاتی تابہ گویا — اور پلک خوں نابہ گویا
آہ سے اس کی مشکل جینا — درد فقط تھا سارا سینہ
دل میں تمنا۔ داغ جگر میں — شیون لب پر۔ یاس نظر میں
نالے شب کو اس کے سن کر — مر گئے کتنے سر کو دھن کر
آہ و فغاں ہی اس کے لب پر — روز ہی ہی ایک آفت سب پر
رو و جبیں پہ خراشِ ناخن — داغوں سے خوں کے قامت گلبن
زخمِ سینہ دل تک پہنچا — کوئی نہ اس گھائل تک پہنچا

آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا
فوّارہ لوہو کا چھوٹا

غم نے تو دل میں کیا ہے چھوڑا
بر میں تھا ایک پکّا پھوڑا

سو نہ[۵] گیا یک دم وہ بے کل
بخت نہ جاگے اس کے اک پل

کام رہا ناکامی ہی سے
تسکین سب بے آرامی ہی سے

رخساروں پر خوں رواں ہو
دل میں ہو سو منھ پہ عیاں ہو

دشنۂ غم سے سینہ کوچا
ناخن سے منھ سارا نوچا

دِل آماجگہِ غمہا کی
اور نفس اک تیرِ خا کی

نے طاقت نے پایا اس کو
ضعفِ دلی نے مارا اس کو

نالۂ دل میں حزینی اس کے
خاطر میں غمگینی اُس کے

رنگ اُڑے چہرے کا ہر دم
تھا گویا گلِ آخر موسم

دست بدل ہر آن رہے وہ
بے طاقت بے جان رہے وہ

رنگ شکستہ بس کہ فسردہ
کہنے کو زندہ لیکن مردہ

خوں باری سے چہرہ گلگوں
حلقِ بسمل دیدۂ پر خوں

جادۂ[۶] دلِ جاری چاک گریباں
گوشۂ دامن واقفِ مژگاں

دیدۂ تر کے دریا قائل
ساحل خشک لبی کے سائل

ہر دم ہو ہر سمت کو جاری
خون باری سے سیلِ[۷] بہاری

تشنہ لبی اک منھ پر پیدا
لب جوشِ[۸] جس کا ہووے نہ دریا

خاک بسر آشفتہ سری سے
شورِ قیامت نوحہ گری سے

سرتاپا آشفتہ دماغی
داغِ جنوں دے جس کو چراغی

غم سے گرچہ دم بھی کہیں تھا
جامے میں اک تار نہیں تھا

رو دی پر جب اپنی آوے
صحرا صحرا خاک اُڑاوے

۵ سویا نہیں   ۶ ختم نہ ہونے والی لکیر۔   ۷ بہار کا اٹھا۔   ۸ اُمنگ۔ موج۔

کلفتِ دل جب خاک فشاں ہو
اشک کی جاگہ ریگِ رواں ہو

گل ان نے از بس کہ کھائے
پھولوں کی چھڑیاں ہاتھ بنائے

دل کے غبار نے راہ جو پائی
شہر میں گویا آندھی آئی

سر پر اس کے سنگ ہمیشہ
جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ

آہ سرد کرے وہ عریاں
بید سا کانپے موئے پریشاں

گرد کی تہ اس کا پیراہن
دامنِ صحرا جس کا دامن

بارِ دامن تارِ گریباں
دامن قربِ جوارِ گریباں

پامالی میں مثلِ جادہ
نقشِ قدم سا خاک فتادہ

دشت تلک گئی آبلہ پائی
دور کھنچی اس کی رسوائی

اس کے جو پامال ہوئے سب
خارِ بیاباں لال ہوئے سب

جن نے دیکھا اس کو یک دم
اس نے کہا یہ بھول کے سب غم

چندے یہ ناشاد رہے گا
یہ مدت تک یاد رہے گا

جلنا اس سے کرے کنارا
جیسے چراغِ وقف بچارا

لو ہو ٹپکے آہِ سحر سے
نالہ گھوواں لختِ جگر سے

رکھتا سدا تھا وہ دیوانا
وردِ زباں یہ شعرِ دانا

صار[1] فوادی[2] شقا شقا[3]
حقا حقا حقا حقا

ہوش و خرد ناشاد گئے سب
دین و دل برباد گئے سب

دردِ دل سے کچھ نہ کہے وہ
ہر ایک کا منھ دیکھ رہے وہ

حسرت اس کی اک عجوبہ
آبِ دہن کی موج میں ڈوبا

غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے
بات کہے تو اشاروں ہی سے

سمجھے تو کوئی داد کو پہنچے
عاشق کی فریاد کو پہنچے

[1] ہو گیا ۔ [2] دل میرا [3] چاک چاک

ورنہ رہے من مار کر اپنا
سر دے مارے ہار کر اپنا

کیونکہ غم سے ہو آزادی
جان کے ساتھ اُس کی ناشادی

کوئی نہ اس پر سایہ گستر
اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر

نے کعبے نے دیر کے قابل
مذہب اس کا سیر کے قابل

کیا کہیے اب کیسا کچھ تھا
القصہ وہ ایسا کچھ تھا

صفتِ دلبر

وہ کیسا تھا جس پر عاشق
جی سے تھا یہ عاشقِ صادق

دیدۂ گل ہیں جاگہ اس کی
نکہتِ گل گرویدہ اس کی

چشم بہ رہ سارا چمن اس کا
نقشِ قدم تھا یاسمن اس کا

آگے اس کے کب خوش آیا
یہ رُو گل نے کہاں سے پایا

گل آشفتہ اس کے رُو کا
سنبل اک زنجیری مُو کا

جب وہ چہرہ تابندہ ہو
ماہِ دو ہفتہ شرمندہ ہو

زلف اُس چہرے پر تابن
کاکلِ صبح سے خوش آئن

دیکھ اس رُخ کی نور افشانی
شمعِ مجلس پانی پانی

ہو ہر چند یہ بدرِ کامل
اس چہرے کے ہو نہ مقابل

حوصلہ کتنا اس بے تہ کا
منھ دیکھو آئینۂ مہ کا

رکھتی تھی دعوے ہم چشمی پہ
لیکن اس کی چشم نظر کر

بہتوں کی جب جانیں گھل گئیں
نرگس کی بھی آنکھیں کھل گئیں

دورِ چشم ہو اس کا جب سے
فتنہ اک سوتا نہیں تب سے

رخ لب سے جاں بخشِ عالم
بلکہ سراپا جانِ مجسم

عیسے کو گر لب یہ دکھا دے
ہرگز اس کو بات نہ آوے

کوئی مرو اندازِ حیا پر
چشم اس کی تھی پشتِ پا پر

کچھ مت پوچھو تنگی دہن کی
مشکل تھی واں جائے سخن کی

کرکے شمیم زلف گذارا
پھیلا وے ہی عنبر سارا

خط آیا ہی گرد اس لب کے
شاید شکر تنگ[1] ہوا ب کے

دونوں لب اس کے لعلِ بدخشاں
دستِ حنائی پنجۂ مرجاں

تھا دیکھا یک[2] رہ پردے میں
برقِ خرمن مہ پردے میں

جس دم برقع منھ سے اُٹھاتا
خورشید اس دم ڈوبا جاتا

پاردلوں کے خدنگ مژہ کا
کاوش کم کم تنگ مژہ کا

بھوں کی کشش سے دوانہ عالم
تیرِ نگہ کا نشانہ عالم

تیغ و تبر تھی ابرو اس کی
آتش سرکش تھی خو اُس کی

نازکی سے مست رہے وہ
اکثر دست بدست رہے وہ

زلفوں کے سب تار پریشاں
سر او پر دستار پریشاں

سائے سے اس کے سرو بنایا
خاکِ رہ سے تدرو بنایا

ہووے خراماں جب وہ کافر
کبک کی ہووے جان مسافر

چشمِ کرشمہ جانِ تغافل
شایاں اس کے شانِ تغافل

کیا جانے وہ حال کسو کا
پتھر دل اس آئینہ رو کا

پاتے ہی ابرو کا اشارا
غمزے نے اک خنجر مارا

جب وہ خرامِ ناز کرے ہی
جی کو جو بہ نیاز کرے ہی

رخصت دے گر عشوہ گری کو
ایک ہی جلوہ بس ہی پری کو

ہنسنے میں وہ صفائی دنداں
برقِ خرمن عالمِ امکاں

رشک سحر کو صفائے تن پر
خون صراحی اس گردن پر

۱ مہنگی ۲ ایک بار

آہ صفائی اس سینے کی
غیرت افزا آئینے کی

شکلِ چیں میں یہ ناز کہاں ہے
صورت ہے انداز کہاں ہے

ایسا خوب جہاں میں کہیں ہے
رحم ہے اس پر اب جو نہیں ہے

جب وہ شکل نظر آتی تھی
کلفت دل کی نکل جاتی تھی

رنگیں اس کی اس کف پا سے
جائیں نکو یاں ابنی جا سے

چشم کرو انصاف کی گروا
یوسف و شیریں لیلےٰ عذرا

کون ہوا اس محبوبی سے
خوبی تو تھی پر اس خوبی سے

بارِ نزاکت کیونکہ اُٹھاوے
شاخِ گل سا لہکا جاوے

ہیگی رگِ گل یا رگِ جاں ہے
پر نازک اسرار میاں ہے

صید فلک قربانی اس کا
یوسف اک زندانی اس کا

اور جو خوباں پاویں اس کو
یک دیگر دکھلاویں اس کو

جاوے اس پر جان سبھوں کی
تیغ لیے ہے درمیاں سبھوں کی

تھانبا جائے کس کے کہے وہ
غصے ہو تو پھر نہ منے وہ

کیا کوئی شوخی اس کی بتاوے
کچھ ٹھہرے تو کہنے میں آوے

کیا ہے اس کے آب و گل میں
آرزو اس کی سب کے دل میں

سب کو میل اس بت کی ادا کا
بندہ کون رہا ہے خدا کا

دیکھے نہ عاشقِ زار کو اپنے
پوچھے نہ بیمار کو اپنے

عاشق ظلم و جور و جفا کا
دشمنِ جانی اہلِ وفا کا

کوچہ رشکِ فزائے کعبہ
واں پہونچے نہ دعائے کعبہ

ہر شب اک فریاد و تظلم
اُٹھ گئی واں سے رسمِ ترحم

آہیں جن کی ورد و وظائف
سو دل خستے واں کے خائف

۱ہ تھا [اگر تو وہ شخص ہوا] ۲ہ زمانے میں نہ ہوا کہ اسے دیکھنا ۳ہ سنبک لگ لغزش ہے آدمی جگہ پر قائم نہ رہ ۴ہ بیٹھا ایک دوسرے کو

دلدار کا جانا اور عاشق کی نوحہ زاری

گر ای خامہ وہ تحریر اب — آوے زباں پر جو تقریر اب
یعنی میر اُس خستہ غم کی[1] — سرتا پا اندوہ و الم کی
بارِ[1] سفر کا مائل ہو کر — حُبِّ وطن کو جی سے دھو کر
رخصت کو اس پاس بھی آیا — جلنے کے تئیں اور جلایا
وقتِ وداع قیامت گزرا — سر سے آبِ حسرت گزرا
ایک دم بے خود ہو کے رہا وہ — اس سے آگے آپ گیا وہ
آنکھیں لگیں ناسور ہو بہنے — دیکھ کر اس کو لگا یہ کہنے
ظلم ہی لو ہو پیتے رہیئے — جان گئی پر جیتے رہیئے
عمرِ عزیز چلی یوں جاوے — اور فلک آنکھوں سے دکھاوے
آخر کر کے خدا کا حوالا — آئینے پر پانی ڈالا
تا کے وہ منھ دکھلاوے شتابی — راہِ دور سے آوے شتابی

یار گئے پر میر جو اب ہی
جان سے خالی اک قالب ہی

راقمِ غم ہی وہ دل تفتہ — نامہ بر اس کا رنگ رفتہ
غم سے فرصت اس کو کہاں ہی — قاصدِ اشک ہمیشہ رواں ہی
خط لکھتا ہی اس مضموں سے — تر ہو بالِ کبوتر خوں سے
خط سے اک آتش پر ہووے — جس سے کباب کبوتر ہووے
جب دردِ دل اُن نے لکھا ہی — شعلہ خط میں لپیٹ دیا ہی
سوز کے آوے جب وہ بیاں پر — شعلہ اک جوں شمع زباں پر
جب کرے خونِ جگر سے انشا — یار کا اپنے شوقِ کفِ پا

[1] اس خستہ غم کا بار۔

ہو انگشت بریدہ خامہ
اور حنائی کا عذر نامہ

راہ پہ بیٹھا وہ سرگشتہ
دیکھے راہِ عمرِ گذشتہ

آگے تھا کب ہجراں دیدہ
آہ و تازہ ظلم رسیدہ

کیا کیا بے طاقت ہوتا ہے
ہر دم جی رخصت ہوتا ہے

حال عجب ہے رنجوری سے
مرنے قریب ہے وہ دوری سے

جب وہ دردِ دل کو جاوے
باتوں پر اس کی رونا آوے

دستہ دستہ داغ لبر ہے
پرکالہ دل پرکالہ جگر ہے

اشک نہیں آنکھوں سے ٹپکتا
ہے یہ گرہ اک دل کی تمنّا

داغ درد ہے گلشن گلشن
گل یہ پھٹے دامن دامن

چھوڑے نہ راہ و رسمِ وفا کو
دے پیغام ہمیشہ صبا کو

پاس اس کے ہو تیرا گر جانا
بھولوں ہوؤں کو یاد دلانا

زیرِ لب اس کے بات یہی ہے
شام سحر دن رات یہی ہے

کھینچیں گے کب تک یہ سختی ہم
پھر بھی ملیں گے جیتے جی ہم

بس اے خامہ رکھ لے زباں کو
تاب نہیں ہے اہلِ جہاں کو

غصہ غم کو نہایت کب ہے
اس سے خموشی اب انسب ہے

حکایتِ عشق

(۵)

چمن سے عنایت کے بادم وار
الٰہی زباں دے مجھے مغز دار

صفتِ عشق کی تا کروں میں بیاں
رہوں عشق کہنے سے میں تر زباں

عجب عشق ہے مردِ کار آمدہ
جہاں دونوں اس کے ہیں بر ہم زدہ

جہاں جنگ[۵۱] صف کی یہ ظالم لڑا
صف اُلٹی جہاں ایک مارا پڑا

اگر لوگ مارے گئے سر بسر
ہوئی فتح اُس کی ہے یہ طرفہ تر

کوئی کشتنی جو طرف ہو گیا
تہِ تیغ اُس کے تلف ہو گیا

جہاں جس کسو سے اسے چاہ ہے
وہیں اس کے تا قتل ہمراہ ہے

کسو سے اگر ہو گئی لاگ سی
دروں میں اس کے لگی آگ سی

ہوا ملتفت یہ کسو سے کہیں
تو نام و نشاں اس کا پھر واں نہیں

وفاق اس کا نکلا سراسر نفاق
پڑا عاشقوں میں عجب اتفاق

جواں کیسے کیسے موئے عشق میں
بہت گھر خراب ہوئے عشق میں

بہت عشق میں لوگ جوگی ہوئے
بہت خاک مل منھ پہ جوگی ہوئے

گئے دشت میں کچھ نمد مو ہوئے[۵۲]
کچھ اک شہر میں پھر کے یکسو ہوئے[۵۳]

کسو کا جگر غم سے خوں ہو گیا
کسو کوہ کن کو جنوں ہو گیا

کوئی زار بار اں بہت رو چکا
کوئی برق سا جل بجھا ہو چکا[۵۴]

غرض عشق کا ہر طرف شور ہے
نئی روز شہروں میں اک گور ہے

بہت جان ناکام دیتے گئے
تمنائے دل ساتھ لیتے گئے

بہت اہلِ اسلام کافر ہوئے
بہت اوّل عشق آخر ہوئے

---

۵۱ جنگ صف بستہ ۵۲ بالوں کا نمدہ بن گیا ۵۳ کنارے لگے۔ مر گئے

بہت جرمِ الفت پہ مارے گئے
جُوا عشق بازی کا ہارے گئے

ہوئے خانداں کیسے کیسے خراب
جواں جوں جوانی گئے کیا شتاب

کیا عشق جس دن سے مرتے رہے
جنوں ہی کا اندیشہ کرتے رہے

کسے عشق نے جی سے مارا نہیں
یہی درد ہے درد چارہ[1] نہیں

دوا عشق کی سخت نایاب ہے
سرِ عاشقاں سنگ کا باب ہے

جو ہو عشق عارض تو پھر یاس ہے
عبث کوئی دن جینے کا پاس ہے

محبت ہی نیرنگ سازِ عجیب
فسانے ہیں اس کے عجیب و غریب

کوئی عشق کرنا دھرا تھا وٹے[2] رہے
گئے میکدے سے بھی صوفی پرے

نہ واں مکر و نے شید[3] و طامات ہے
خرابات جانا کرامات ہے

کہیں عشق نے آرزو کش کیے
گئے خوش جو عاشق سو ناخوش کیے

کہیں سہل تر یار مرنے لگے
کہیں لوگ دشوار مرنے لگے

کہیں کام ان نے کیے ہیں عجب
فسانہ ہوئی بزمِ عیش و طرب

کہیں بادشہ اس سے درویش ہیں
کہیں اس سے درویش دل ریش ہیں

لیا کاہ کا کوہ سے کیں[4] کہیں
ملائے کہیں آسمان و زمیں

کہیں پڑ گئے اس سے فتنے فساد
رہے زیرِ شمشیر حد سے زیاد

یہ عالم کا آشوب ہے دہر سے
مرادِ خطرگہ ہے اس شہر سے

ہوئے عشق میں زہد کیشاں خراب
رہے دل شکستہ پریشاں خراب

اٹھا عشق کا شورِ عزلت گزیں
گئے دشت گردی کو کر ترکِ دیں

ہوا عشق سے مجلسِ حال دہر
تواجد لگے کرنے شیخانِ شہر

کیا عشق میں ترکِ صوم و صلوٰت
گئے اہلِ مسجد سوئے سومنات

مسلماں ہوئے عشق میں برہمن
گئے کعبے کو چھوڑ دینِ کُہن

[1] درد کا علاج [2] اس کا رستہ آسان۔ [3] فریب [4] بہلہ۔ انتقام۔

نہ سبحہ نہ زنار نہ کفر و دیں — جہاں سب ہے عشق اور کچھ بھی نہیں
محبت کے ساغر کش اہلِ صلاح — یہ سب بے ہوش دارو ہے ان کی فلاح
کوئی ہوش میں اپنے رہتا نہیں — ہر اک چپ ہے کچھ کوئی کہتا نہیں
نمازی ہیں خانہ سیہ عشق میں — مصلے ہوئے ان کے تہ عشق میں
ہمہ خاندانِ نقاوت خراب — خرابے سے ہیں بے تفاوت خراب
یہی عشق جس سے کہ حاصل ہے کام — یہی عشق ہے جس سے نکلا ہے نام
اسی عشق سے روسیہ روسفید — رکھیں عشق سے نا امیداں امید
یہی عشق ہے عقدۂ دل ہے یہ — یہی عشق حلّالِ مشکل ہے یہ
کہیں اس کو لڑنے سے پایا معاف — کہیں ان نے میدان مارے ہیں صاف
کہیں مومنانہ اسے دردِ دیں — کہیں کافرانہ ہوا بے یقیں
غرض عشق ہے طرفہ نیرنگ ساز — کہیں ناز یکسر کہیں ہے نیاز

حکایت

جوان خوش تھا پرکار و پرہیزگار[۵۱] — بہت حسن کا اس کے واں اشتہار
بہ صورت بہ طاعت بہ دامانِ پاک — نہ دامن پہ مانند گل گرد و خاک
اگر ہووے حورِ بہشتی دوچار — وہ دریائے حسن اس سے ڈھونڈے کنار[۵۲]
وگر آگے سے ہو پری کا گزر — حیا سے نہ اس پر کرے ٹک نظر
رہے محو پاکیزگی و صلوات — نہ ہو ترک سہواً کبھی واجبات
تناسب بہت اس کے اعضا سے خوب — سراپا میں دیکھو تو ہر جا ہے خوب
زبان نرم طالع وری و صلاح — نہ طنز و کنایہ نہ رمز و مزاح
خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خو — کسو وقت رہتا نہ تھا بے وضو
جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف — لبِ سرخ پر دلبروں کا نہ حرف

[۵۱] پرہیزگاری [۵۲] کنارہ۔ علیحدگی

حیا کو سیاہی سے پلکوں کی راہ | نکلتی تھی باہر نہ گاہے نگاہ
بہت پاک دامن معیشت ہوئی | نظافت[1] نزاہت میں مدت ہوئی
کہ ناگاہ اس راہ یک زن گئی | جیوں پر خدا جانے کیا بن گئی
جواں کی نظر شرمگیں جا لڑی | وہ شرمائی آنکھ اس کے اوپر پڑی
یہ دل مستقل ناشکیبا ہوا | دل طرفِ ثانی بھی بیجا[2] ہوا
نگاہیں ہوئیں ہم دگر آشنا | محبت کا دونوں نے پانی بھرا
یہی مدتوں دیکھا دیکھی رہی | دلوں کی کسو سے نہ ہرگز کہی
جیوں میں شب و روز مرتے رہے | ولے پاس ظاہر کا کرتے رہے
رہے دیر تک دونوں ناکام عشق | نہ آیا لبوں پر کبھو نام عشق
یہ کیا دخل اظہارِ الفت کریں | یہی بستہ لب مشقِ حیرت کریں
گھروں میں نگاہیں تھیں کلفت بھری | در و بام پر پڑتیں حسرت بھری
لبوں پر نہ آیا کبھو حرفِ عشق | اگرچہ ہمہ تن رہے صرفِ عشق
بجایا کیے پردے میں سازِ دل | نہ نکلا کوئی نغمۂ رازِ دل
دہانوں میں تو گرم جوشی رہی | دہانوں پہ مہرِ خموشی رہی
کریں حسرت آگیں نگہ چار اور | لب ان کے یہ ساکت سروں بیچ شور
کسو سے بھی حرف و حکایت نہیں | محبت سے شکر و شکایت نہیں
کہیں دردِ دل سو کبھو زیرِ لب | وگرنہ سکوت ان کو تھا جب تب
شب و روز دونوں تھے صورت مثال | بہم محوِ خوبی و صرفِ خیال
پیے جائیں آنکھیں بھری بہرِ ضبط | کہ جانا نہ جاوے یہ آپس کا ربط
کبھو آہ اٹھے تو دم سرد ہو | کہیں منکشف تا نہ یہ درد ہو
دلوں میں جو تھی چاہ خوں ہو گئی | گرفتہ رہی سو جنوں ہو گئی

[1] پاکزگار۔ [2] بے ٹھکانے۔

بیاباں کی جانب کھنچے دل بہت
کہ تھا شہر میں کام مشکل بہت

ارادے سے ہوئے یہ دلوں ہی میں گُھن
کیا پھر بھی دونوں نے صبر و سکوں

صبا سے رہے دو طرف کے پیام
کہ ای باد کہیو یہ بعد از سلام

خیالات ملنے کے جاتے نہیں
قرار و سکوں دل تک آتے نہیں

شب و روز رہتا ہی یاں اضطراب
کیا شوق نے کام کو کیا خراب

کوئی طور ملنے کا ایجاد کر
نہ جو رحم سے ہو تو بیداد کر

پیام ایک کا یہ کہ ای بادِ نرم
کہا اس کو محبت سے کچھ بھی ہی شرم

تنِ زار بے جان کیونکر جیئے
جگر میں نہ ہو خون تو کیا پیئے

ملاقات کا رکھیئے کیونکر خیال
رہے کیونکہ جاں نا امیدِ وصال

اگر دیکھیں آنکھیں ہیں وہ اس طرف
دگر منہ ہمارا ہی سو اس طرف

اسے دیکھنا ہی ہو ارمان بھی
ادھر ہی چلی جائے ہی جان بھی

کہا اس سے کہ مرتے ہیں تیرے لیئے
کیا عشق۔ یا جرم ہم نے کیئے

نہیں صبر آتا ترے بن ملے
لبوں سے جگر تک بھریں ہیں گلے

کسو سے کسو کو نہ ہو جائے لاگ
کہے تو لگائی ہی سینے میں آگ

کسو کا کسو سے نہ لگ جائے دل
کہ کہنا پڑے ہائے دل وائے دل

کسو کی نہ اچھی لگے کوئی آن
کہ جانِ المناک دیجے ندان

کسو کے مجعّد[1] نہ کھل جائیں بال
کہ ہو دل کے عقدوں کی اشد محال

کسو لالہ رُخ کا نہ اُٹھے نقاب
کہ ہوں داغ دونوں مہ و آفتاب

قد آرا نہ ہو فتنۂ در سر کوئی
کہ سر پر قیامت رکھے ہر کوئی

کسو کی نہ چاہِ زنخ میں گریں
مبادا کہ واں سے نہ جیتے پھریں

کسو کے نہ انداز پر جاسے جا
صبا ہو سے کیا جائیے کہا سے کیا

[1] جوڑا بندھے ہوئے۔

کسو کی نہ آنکھوں کو دیکھا کریں
کہ لوگ اس کا آخر پرچھا[1] کریں

کسو کے نہ ایمائے ابرو پہ جائیں
فریبِ فریبندگاں تا نہ کھائیں

صبا چلتے اس سے یہ کہہ آئیو
کہ غافل ہی ہم سے نہ ہو جائیو

دل زار تجھ بن ہی بے کل بہت
نہ جی کو مرے بن ملے مِل[2] بہت

گئے ہم سے پھر ہاتھ آتے نہیں
یہ گم گشتہ پھر پائے جاتے نہیں

انھیں کا نہیں رہتا نام و نشاں
کوئی ان کو ڈھونڈھے تو پھر کہاں

کہیں یوں فراموش ہوتے ہیں یار
ہمارا ترا عشق ہے یادگار

ترحم کہ اب بھی گیا کچھ نہیں
تلطف کہ ہم ہیں رہا کچھ نہیں

نہ کر یوں کہ افسوس باقی رہے
گل تر یہ چنداوس باقی رہے

گھٹی جان جاتی ہے یوں ہر زماں
تلف جیسے ہر دم ہو آبِ رواں

نہ ہو جاتی اے کاش الفت ہمیں
اٹھانی نہ پڑتی یہ کلفت ہمیں

نہ آنکھیں لگی ہوتیں ناگاہ کاش
کہ چھاتی کی دل تک نہ جاتی خراش

نہ دل کو ہوئی ہوتی چسپیدگی
کہ داغوں کو ہوتی نہ بالیدگی

نہ پڑتی مری آنکھ گر اس کی اور
تو اٹھتا نہ سر سے جنوں کا یہ شور

ہوئی آتشِ عشق آخر بلند
جگر دل ہوئے دونوں اس کے سپند

زبانیں تھی اس آگ کی کیا دراز
ہوئی دونوں بتیابوں کی جاں گداز

پڑی آگ وہ دل جگر جل گئے
جگر دل نہ بل دونوں گھر جل گئے

ہوا ناگہاں شوہر زن مریض
نہایت ہوئی تپ طویل و عریض

بدن کاہ سا رنگ کاہی ہوا
بہت حال اس کا تباہی ہوا

دموں پر بھی وہ رفتنی کم رہا
ٹھہر کر گئے دم ہوا ہو گیا

جلانے کی تیاری کرنے چلے
چلی زن بھی تا ساتھ اس کے جلے

[1] تاڑلو، چرچا کریں ۔ [2] ملنسار

لگی سب جلنے چھوڑا نہ اصرار کو — خبر پہونچی اس نوگرفتار کو
کہا ہم کو کیا کہتی ہو اس گھڑی — نظر اُس کی جلتے جو اُس پر پڑی
کہا آسے ہو تو چلے آؤ تم — شتابی کرو جو ہمیں پاؤ تم
یہ بیتاب تھا آگ پر پھر پڑا — پتنگا سا اس آگ پر گر پڑا
لگے آتے تھے کتنے انفار ساتھ — وہیں کھینچ لائے اسے ہاتھوں ہاتھ
قدم کتنے چل کر وہ آتش بجاں — ہوا یوں سخن زن کہ اے دوستاں
نہیں متصل راہ چلنے کی تاب — کہ ہوں نیم سوز آگ کا میں کباب
توقف کیا سب نے زیرِ درخت — کہا واقعی رنج کھینچا ہے سخت
نہ جانا کہ ہے مانع راہِ عشق — رکھے ہے عجب جذب جاں کاہ عشق
نہ آتش نہ گرمی نہ بے طاقتی — بہانے ہیں سب جذب ہے اُلفتی
عجب تر نظر آتے ہیں کارِ عشق — نہیں سمجھے جاتے ہیں اسرارِ عشق
اگر آنکھیں کھلیں تو اُدھر نظر — ہوئی خاک معشوقہ جل کر جدھر
گیا منتظر اس کو وہ دن تمام — نظر کر کے کیا دیکھتا ہے کہ شام
خراماں چماں آئی ہے وہ پری — وہی ناز و عشوہ وہی دلبری
وہی صورت اس کی ہے جلوہ نما — وہی رنگِ روگل کا غیرت فزا
اُسی طرز و انداز و خوبی کے ساتھ — اُٹھایا اسے ہاتھ میں لیکے ہاتھ
گئے اس طرف لے جدھر تھی چلی — نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی
ہوئی جاتے جاتے نظر سے نہاں — گیا عشق کیا جانے لیکر کہاں

نہ کر میر اب عشق کی گفتگو
قلم اور کاغذ کو رکھدے بھی تو

فسانے ہیں اس کے ہزاروں ہزار
بہت خاک جل جل کے یاں ہو گئے

یہی کشت و خوں کا ہے یہ گرم کار
رہِ عشق میں جی بہت کھو گئے

غرض ایک ہے عشق بے خوف و باک
کیے دونوں معشوق و عاشق ہلاک

معاملاتِ عشق

(۶)

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق — حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ — عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق تھا جو رسول ہو آیا — ان نے پیغامِ عشق پہونچایا
عشق حق ہے کہیں نبیؐ ہے کہیں — ہے محمدؐ کہیں علیؑ ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق حاضر ہے عشق غائب ہے — عشق ہی مظہرِ عجائب ہے
عشق کیا کیا مصیبتیں لایا — روز کو رات کرکے دکھلایا
عشق میں لوگ زہر کھاتے ہیں — عشق سے رنگ سبز لاتے ہیں
عشق سر تا قدم اُمید ہوا — زیرِ تیغِ ستم شہید ہوا
مجھ سے یہ پوچھ مت کہیں ہے عشق — عشق ہے اُن ہی کو جنھیں ہے عشق
عشق سے رنگ زرد ہوتا ہے — عشق سے دل میں درد ہوتا ہے
رہتے ہیں عشق ہی میں مژگاں تر — یہیں دیکھی ہیں آنکھیں آتے بھر
عشق ہی کا خراب ہے کنعاں — عشق ہے ایک خانہ آباداں
عشق لایا ہے آفتیں کیا کیا — اس سے آئیں قیامتیں کیا کیا
قیس کیا رنج کھینچ کھینچ موا — سر پہ فرہاد کے سُنا جو ہوا
عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں — آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں
عشق میں ایک جی کو کھو بیٹھے — ایک آنکھوں کو رو کے رو بیٹھے

ایکوں کا جیب تا بدامن چاک
ایک ڈالے ہے سر کے اوپر خاک

شان ارفع ہے جن کی خواہیں یاں
عقل والے جنوں شعار ہیں یاں

خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے
بادشاہ عشق میں فقیر ہوئے

کوئی دل تنگ ہو کوئیں میں گرا
کوئی ڈوبا کوئی گیا نہ پھرا

جب پتنگا ہوا تھا اس سے داغ
تب دیا جی کو ان نے پیش چراغ

عشق کی فاختہ ستمکش ہے
عشق سے عندلیب دم کش ہے

عشق باعث ہوا وطن چھوٹے
مرغ پکڑے گئے چمن چھوٹے

مایۂ درد و رنج سب ہے عشق
متصل رونے کا سبب ہے عشق

پڑ گئے دل جگر میں آخر چھید
کچھ نہ پایا کھنوں نے عشق کا بھید

تیز تیغِ ستم جو اینچے عشق
جامے بہتوں کے خوں میں کھینچے عشق

عشق سے قمری ہے حریفِ سرو
مہ سے آنکھیں لڑا رہا ہے تدرو

عشق کے دل فگار سارے ہیں
اِن نے کیا کیا جوان مارے ہیں

کہیں حق ناحق ان نے خون کیے
کہیں سر پر کھڑا ہے تیغ لیے

کوئی محوِ گزاف ہیں اس سے
کہیں میدان صاف ہیں اس سے

اس سے یک جمع نے لیا ہے جوگ
ایک فرقے کا ہے یہ جی کا روگ

ایک کے لب پہ آہ ہے اس سے
ایک کا دن سیاہ ہے اس سے

ایک کا شیوہ اس سے نالہ کشی
ایک کو بے دمی ہے جیسے غشی

ایک ناشاد زندگانی سے
ایکوں کے دل گداز پانی سے

ایک کے پھول گل پہ نالے ہیں
ایک کی جان ہی کے لالے ہیں

ایک نے کوہ اس سے توڑ دیے
ایک تنکا کر اُن نے چھوڑ دیے

چپ لگی ہے کسو کو اس کے سبب
بند رہتے نہیں کسو کے لب

کوئی باتیں کرے ہے شوق کے ساتھ
کوئی چپکا ہوا ہے ذوق کے ساتھ

ہے تواجد کسو کو حال کہیں
کہیں نقصان ہے کمال کہیں

ایک محوِ لباسِ عریانی
ایک سرگرمِ دامن افشانی

کسو کو فکر کوئی ذاکر ہے
کوئی صابر ہے کوئی شاکر ہے

کہیں وسعت کہیں ہے تنگ اوقات
عشق کے ہیں گے مختلف اوقات

سیر قابل ہیں اس کے دیوانے
سننے کے گو ہیں اس کے افسانے

وصل میں جن کے دل رہیں بیجا
فصل ہو تو انھوں کا حال ہو کیا

اس بلا سے مجھے بھی کام ہوا
عاشقِ زار میرا نام ہوا

قصہ میرا بھی سانحہ ہے عجب
کس پہ گزرا ہے یہ ستم یہ غضب

(۱)

ایک صاحب سے جی لگا میرا
ان کے عشووں نے دل ٹھگا میرا

ابتدا میں تو یہ رہی صحبت
نام سے ان کے تھی مجھے الفت

خوبی ان کی جو سب کہا کرتے
گوش میرے ادھر رہا کرتے

بختِ برگشتہ پھر جو یار ہوئے
اک طرح مجھ سے وے دوچار ہوئے

کیا کہوں طرز دیکھنے کی آہ
دل جگر سے گزر گئی وہ نگاہ

چھپکے منہ ان کا دیکھ رہتا ہوں
جی میں کیا کیا ہی کچھ نہ کہتا ہوں

پیار چتون سے پھر نکلنے لگا
دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا

کچھ کچھ آزار مجھ کو دینے لگے
قسم اقسام مجھ سے لینے لگے

ایک دو دن میں بعدِ رفعِ ملال
لطف سے پوچھنے لگے کہو کچھ حال

جو گزرتی تھی مجھ پہ میں کہتا
ہا کوئی اشکِ آنکھ سے بہتا

۱؎ بے ٹھکانے

کیا کہوں کیا قدِ بالا ہے
قالبِ آرزو میں ڈھالا ہے

ایک جاگہ سے ایک جاگہ خوب
پیکرِ نازک اُس کے سب محبوب

موئے سر ایسے جی بھی کریے نیاز
بل ہی کھایا کرے یہ عمرِ دراز

اس کی کاکل سے حرف سر نہ کرو
کاکلِ صبح پر نظر نہ کرو

کچھ بھی نسبت ہے تم کو سودا ہے
کالے کوسوں کی بات کا کیا ہے

اُس کی زلفوں میں دل گئے نہ پھرے
رہے سنبل کے پیچ پاچ دھرے

اُس جبیں سی ہے دل کی کب جاذب
صبحِ صادق کی دعوی ہے کاذب

ویسی بھوئیں کشیدہ بھی ہیں کہیں
یہ کمانیں کسو سے کھنچتی نہیں

پھری پلکوں کی اُور سب کی نگاہ
چشم پر میری تیری چشمِ سیاہ

کہوں چتون کے دیکھنے کا طور
اس قیامت پہ وہ قیامت اور

سطحِ رخسار آئینے سے صاف
جو نہ ٹھہرے نگہ تو رکھیے معاف

لطفِ بینی کا فہم ہے دشوار
ایک باریک بینی ہے درکار

کیا جھمکتا ہے ہائے رنگِ قبول
جیسے نکھرا گلاب کا سا پھول

ہے دہن تنگی سے سخن کوتاہ
کچھ نکلتی نہیں سخن کی راہ

اس سے گل کیا چُنے کوئی ہمدم
غنچۂ ناشگفتہ سے بھی کم

برگِ گل سے زباں ہے نازک تر
پھول جھڑتے ہیں بات بات اوپر

کیا کہوں کم ہیں ایسے شیریں گو
وہ زباں کاش میرے منھ میں ہو

ان لبوں کا مزا لیا سنو بھانت
قِس کے اوپر ہمارا ابھی ہے دانت

کوئی جاں بخش یوں کہے سو کہے
ہم تو مرتے ہی ان لبوں پہ رہے

کنجِ لب آرزوئے جان و دل
آگے چلنا نگاہ کو مشکل

ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے
قند و مصری کو کیوں نہ نام رکھے

ملہ نذر کر دیجیے۔

جو حلاوت انھوں کی کہیے اب — ہم دگر سے جدا نہ ہوویں لب
جب وہ کھاتے ہیں بیڑۂ پان کو — رو نہیں دیتے لعل و مرجان کو
ایسی ہوتی نہیں ہے سرخ بھی — رنگ گویا ٹپک پڑے گا ابھی
ہو تبسّم سے لعل کا دل خوں — ہنستے دیکھا تھا سو مجھے ہے جنوں
نہیں دیکھے مسی ملے دنداں — برقِ ابرِ سیہ ہے تب خنداں
کیسے کیسے چمکتی ہے بے ستہ[2] — جگ ہنسائی کرے ہے اپنی یہ
ہو اگر کیجیے اس رخ کا سیب — جائے سر سے جنوں کا آسیب
کیا نظرگاہ کی کروں خوبی — نظریں اٹھتی نہیں یہ محبوبی
شانہ و دست ساعد و بازو — دل کشی میں تمام یک پہلو
یوں نہیں سرخ اس کی ہر انگشت — ڈوبی ہیں میرے خون میں یکمشت
وہ کفِ دست راحتِ جاں ہے — کاش سینے پہ رکھدے غم یاں ہے
کیا بیاں خوبیِ شکم کو کرے — دیکھنے سے کبھو نہ پیٹ بھرے
صدر کے ناچے سے لے تا ناف — چپ کی جاگہ ہے کیونکہ کہیے صاف
گئی نظروں سے وہ کمر باریک — ہو نہ آنکھوں میں کیوں جہاں تاریک
نازکی اس میاں کی کیا کہیے — بنے تو ہاتھوں میں لیے رہیے
ٹک اگر لچکے تو قیامت ہے — پھر قیامت تلک ندامت ہے
کیوں پڑی ران پر نظر تا ساق — اس بن اب زندگی ہوئی ہے شاق
پائے جاناں سے گفتگو ہے اب — خاک میں ملنے کا یہی ہے ڈھب
وہ کفِ پا قریب ہو میرے — ٹھوکر اس کی نصیب ہو میرے
پنڈلی نازک ہے شاخِ سنبل کی — پشتِ پا پنکھڑی سی ہے گل کی
ناخنِ پا حنائی ہیں ایسے — برگِ گل پائے سرو ہوں جیسے

[2] گوشہ۔ کنارہ

ہو خراماں تو اس طرف نگہیں[۱] — گُل کفش اُس کی لوگ دیکھ رہیں
گُل و بلبل سبھی تماشائی — آ گئے جس طرف بہار آئی
رنگِ رفتار دیکھ مجنوں ہو — طرزِ گفتار جیسے افسوں ہو
سر سے پاؤں تلک وہ محبوبی — ساتھ ان خوبیوں کے یہ خوبی
کہ بہت دل ہی آشنائے رحم — دردمندوں کو جانے جائے رحم
نہیں آزار کی روا داری — مہر ورزی ہی یا وفاداری
پر جو معشوقی آب و گِل میں ہی — چھیڑ رکھنے کا شوق دل میں ہی

(۳)

جانتے تھے کہ ہی یہ دل دادہ — سیدِ خستہ خاک افتادہ
دیکھتے مجھ کو جو پریشاں دل — کہتے ای میر کچھ نہیں حاصل
دیکھ ٹک تو ہی تیرا حال ہی کیا — جانے دے اب بھی یہ خیال ہی کیا
آفتِ جاں ہی دوستی کرنا — کب تلک گھُٹ کے اس طرح مرنا

(۴)

گُل رووں بن جگر ہی داغِ کباب — گیسوؤں بن ہی جی کو پیچ و تاب
صورت ان کی خیال میں ہر دم — خواب میں جو ہو وہ مزہ باہم
میں تو بستر پہ دل شکستہ اُداس — چاند سا مُنھ اُنھوں کا تکئے پاس
میں بچھونے پہ بیخود و بےخواب — ایک پیکر پری کا سا ہم خواب
میں تو اُفتادہ محوِ عجز و نیاز — بازوؤں پر کسو کی بالشِ ناز
جلتی آنکھوں سے گُل رخسار — جس پہ کچھ بکھرے موئے عنبر بار
پاس منھ کے دے لال[۲] تر نازک — دستِ گستاخ پر کمر نازک
فرش اس گلبدن سے سب بو[۳] پا — پھول میں نے بچھائے تھے گویا

۱ یعنی نگاہیں ۲ ہونٹھ ۳ خوشبودار

شب کٹے صورتِ خیالی سے
دن کو ہوں میں شکستہ حالی سے

گرچہ روزانہ یہ تصور تھا
لیکن اندوہ سے مکدّر تھا

کہیں تصویر سی نظر آئی
کہیں منھ پھیر جیسے شرمائی

صورتِ حال اور کچھ ہر دم
گاہ لب خشک گاہ مژگاں نم

آشنا یار سارے بیگانے
کہ ہوئے میر جی تو دیوانے

رشتۂ ربط اُنھوں نے توڑ دیا
ملنا جلنا سبھوں سے چھوڑ دیا

نظر آتے نہیں ہیں مدت سے
اُنس پیدا کیا ہے وحشت سے

صبح ہوتے ہی گھر سے چلتے ہیں
جیسے کھوئے گئے نکلتے ہیں

چلے جاتے ہیں دیکھتے ہی راہ
پر کہیں کی کہیں پڑے ہے نگاہ

مل گیا جو کوئی تو بچ نکلے
سری خبطی دیوانے بچ نکلے

شوق سے ان کے حال دیگرگوں
پارہ پارہ دل و جگر سب خوں

رنگ ہر دم مزاج کا کچھ اور
کل کا کچھ اور آج کا کچھ اور

کیا بیاں کریئے بے قراری کا
ذکر کیا حالِ اضطراری کا

جی پڑا ترسے ساتھ سونے کو
دل پریشان جمع ہونے کو

۵

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط
ہو سکا پھر نہ دو طرف سے ضبط

تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب
جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب

ایک دن ہم وے متصل بیٹھے
اپنے دل خواہ دونوں مل بیٹھے

ہو گئے بخت اپنے برگشتہ
پھر گیا آسماں نے سرگشتہ

بات ایسی ہی اتفاق پڑی
کہ ہوئی سر پہ فرقت آن کھڑی

دل ٹھہرتا نہ تھا ملالت تھی
جان کو رفتگی کی حالت تھی

اب جو گھر میں ہوں تو فسردہ سا — چار پائی پہ ہوں تو مُردہ سا
جی اُنھوں میں فسردہ قالب یاں — متحرک ہو کیا تنِ بے جاں
حال دل کا کہوں جو ہمدم ہو — کروں پیغام کچھ جو محرم ہو
جی میں کچھ آیا رو کے بیٹھ رہا — دل زدہ چپکا ہو کے بیٹھ رہا
دیکھیے چندے یوں رہیں گے جدا — چاہیے ہی کیا ہمارے حق میں خدا
خونِ دل کب تلک پئیں گے ہم — رنگ یہ ہے تو کیا جئیں گے ہم
یاد کر روؤں ان کی کونسی بات — کس طرح کاٹوں ہجر کے اوقات
ملنا ان سے بھی ہو گئے غم بھی — آئے جیتوں میں جانیے ہم بھی
مدّتِ ہجر اگر تمام ہوئی — ورنہ اپنی تو صبح شام ہوئی

لہ لب تاس

خواب و خیال

(۷)

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے
کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

رہیں جانِ غم ناک کو کاہشیں
گئیں دل سے نومید سو خواہشیں

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

گئی کب پریشانیِ روزگار
رہا میں تو ہم طالعِ زلفِ یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہونچی خبر مجھ کو آرام کی

اُٹھاتے ہی سر یہ پڑا اتفاق
کہ دُشمن ہوئے سارے اہلِ وفاق

جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ
دکھانے لگے داغ بالائے داغ

زمانے نے آوارہ چاہا مجھے
مری بیکسی نے نباہا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی
غریبی نے ایک عمر کی ہمسری

مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا

بندھا اس طرح آہ بارِ سفر
کہ نہ زادِ رہ کچھ نہ یارِ سفر

دل اک یار سو بے قرارِ بتاں
غبارِ سرِ رہ گزارِ بتاں

گرفتارِ رنج و مصیبت رہا
غریبِ دیارِ محبت رہا

چلا اکبرآباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشمِ حسرت پڑی

کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دل مضطرب اشکِ حسرت ہوا
جگر رخصتانے میں رخصت ہوا

کھنچا ساری رہ دامنِ چاکِ دل
رہا بر قفا روئے غم ناکِ دل

پس از قطعِ رہ لائے دلی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزارِ سخت

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام — لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
کبھو کف بلب مست رہنے لگا — کبھو سنگ در دست رہنے لگا
کبھو غرقِ بحرِ تحیر رہوں — کبھو سر بجیبِ تفکر رہوں
یہ وہمِ غلط کاریاں تک کھنچا — کہ کارِ جنوں آسماں تک کھنچا
نظر رات کو چاند پر گر پڑی — تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی
مہِ چار دہ کارِ آتش کرے — ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے
توہم کا بیٹھا جو نقشِ درست — لگی ہونے وسواس سے جان سست
نظر آئی اک شکل مہتاب میں — کمی آئی جس سے خور و خواب میں
اگرچند پرتو سے مہ کے ڈروں — ولیکن نظر مو طرف ہی کروں
ڈروں دیکھ مائل اسے اس طرف — بحدے کہ آجائیں ہونٹوں پہ کف
پڑی فکرِ جاں میرے احباب کو — اڑا دیویں سب گھر کے اسباب کو
کوئی پاس کوئی تفاوت سے ہو — سراسیمہ کوئی محبت سے ہو
کوئی فرطِ اندوہ سے گریہ ناک — گریباں کسو کا مرے غم سے چاک
جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے — نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے
کہے چشم بندی کو ہر یار و غیر — ولے منزلِ دل میں اس مہ کی سیر
وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا — تصور مری جان کے ساتھ تھا
اگر ہوش میں ہوں دگر بے خبر — وہ صورت ہے میرے پیشِ نظر
اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ — وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
نگہ گردشِ چشم سے فتنہ ساز — مژہ آفتِ روزگارِ دراز
عجب رنگ پر سطحِ رخسار کا — مگر تھا وہ آئینہ گلزار کا

جو آنکھ اُس کی بینی سے جا کر لڑے
دمِ تیغ پر راہ چلنی پڑے

مکاں کُنجِ لب خواہشِ جان کا
تبسّم سبب کاہشِ جان کا

دہن دیکھ کر کچھ نہ کہیے کہ آہ
سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ

سزا ہے جگر اس کسو کے لیے
جو سیبِ ذقن اس کا بوکر[۵۷] جیے

گلِ تازہ شرمندہ اس رو سے ہو
خجل مشکِ ناب اس کے گیسو سے ہو

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے
کہیں بادۂ حسن سے مست ہے

کہیں نقشِ دیوار دیکھا اسے
کہیں گرمِ رفتار دیکھا اسے

کہیں دل بری اس کو درپیش ہے
کہیں مائلِ خوبیِ خویش ہے

کہیں جملہ تن مہرِ صرفِ سلوک
کہیں مجھ سے سرگرمِ حرفِ سلوک

لطافت سے یک جان ہووے تمیز
سبک سیر مانندِ عمرِ عزیز

کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز
کہیں ایستادہ بصد رنگِ ناز

ہر اک جا سے لے ناز سے وہ سبق
در و بام تصویر کا سا ورق

رہے سامنے اک طرح پر کبھو
رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو

بغل میں کبھو آرمیدہ رہے
کبھو اپنے بر خویش چیدہ رہے

کبھو صورتِ دل کش اپنی دکھائے
کبھو اپنے بالوں میں منھ کو چھپائے

کبھو گرمِ کینہ کبھو مہرباں
کبھو دوست نکلے کبھو خصمِ جاں

کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ
کبھو دست بردار ہو جائے وہ

گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو
طرح دشمنی کی نکالے کبھو

کبھو چیں بہ ابرو کبھو ہنستے بات
کبھو بے وفائی کبھو التفات

جو میں ہاتھ ڈالوں تو واں کچھ نہیں
بجز شکلِ وہمی عیاں کچھ نہیں

۵۷ سونگھ کر

ہر اک رات چندے یہ صورت رہی
اسی شکل وہمی سے صحبت رہی

دمِ صبح ہو گرم رہ سمجے ماہ
کہ در پیش آوے یہ روزِ سیاہ

کہ جھو ما کروں بید مجنوں کی طرز
رہے یاد اُس سروِ موزوں کی طرز

رہوں زرد میں گاہ بیمار سا
پریشاں سخن گہ پری[1] دار سا

پری خواں کو لا کوئی افسوں پڑھائے
کسو سے کوئی جا کے تعویذ لائے

طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے
نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے

دوا جو لکھی سو خلافِ مزاج
کھچا اس خرابی سے کارِ علاج

کہ سر رشتۂ تدبیر کا گم ہوا
دل اوپر ہجومِ توہم ہوا

دروں خود بخود بے حواسی رہی
پریشاں دلی اور اُداسی رہی

کروں بے کلی جاؤں تا ہر کہیں
نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں

قیامت جنوں کا رہے سر میں شور
کھچا جائے دل کوہ و صحرا کی اور

رہے شوق سر در گریبانِ دل
ہوا کھینچے صحرا[2] کو دامانِ دل

سرِ آشفتہ زلفِ گرہ گیر کا
قدم حلقہ در گوش زنجیر کا

جنوں آہ در پے ہوا جان کے
مجوز ہوئے یار زندان کے

کیا بند اک کوٹھری میں مجھے
کہ آتش جنوں کی نگرواں بجھے

لبِ نان اک بار دینے لگے
دمِ[3] آب دشوار دینے لگے

کہاں علم کا کسب فرصت نہ آہ
ہوا کا بھی واں گشت دونن کی راہ

نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے
کہ کیا جانیئے کیسی صحبت بنے

وہ آشفتہ سر ہوشمندی سے دور
نہیں رابطِ مقتضائے شعور

وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر
در اُس کا نہ کھلتا تھا دو دو پہر

جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا
تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا

۱ جس پر پری کا سایہ ہو۔ ۲ جنگل کی طرف۔ ۳ مشکل سے ایک گھونٹ پانی

سرِ شام بیٹھا تھا میں ایک روز ۔۔۔ افاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز
کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی ۔۔۔ مرے خوں[۲] میں کچھ نہ تقصیر کی
اگرچند کہنے کو خوں کم کیا ۔۔۔ لیا لوہو اتنا کہ بے دم کیا
بڑی دیر تک خون جاری رہا ۔۔۔ میں بے ہوش وہ رات ساری رہا
جگا یا سحر مجھ کو اک شور سے ۔۔۔ کھلی آنکھ میری بڑے زور سے
وہی دستِ فصاد میں نیشتر ۔۔۔ وہی رنگ صحبت کا پیشِ نظر
وہی لوہو لینے کا ہنگامہ پھر ۔۔۔ وہی تر بتر لوہو میں جامہ پھر
لگے نشتر ایسے کہ سہ لگتے نہیں ۔۔۔ چُبھی جیسے مژگاں کسو کے تئیں
ہوا خون سے دامن و جیب تر ۔۔۔ رگِ جاں تلک زخم پہونچا مگر
ٹپکتا رہا دیر تک خونِ ناب ۔۔۔ مجھے لے گئی بے خودی کی شراب
سخن ضعف سے سخت دُشوار تھا ۔۔۔ پلک کا اُٹھانا بھی اک بار تھا
کئی روز بالیں پہ یہ سر رہا ۔۔۔ خمار ایک مدت تلک پھر رہا
کھڑا ہوں اگر پاؤں لغزاں رہے ۔۔۔ بدن بید کی طرح لرزاں رہے
چلا جائے سر پاؤں تھرتھر کرے ۔۔۔ نسیمِ سحر کارِ صرصر کرے
جفا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی ۔۔۔ افاقت گئی یوں کہ گویا نہ تھی
پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں ۔۔۔ نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں
بندھا ناتوانی کا رختِ سفر ۔۔۔ کیا طاقتِ رفتہ نے منھ ادھر
کسے تھا مری زندگانی کا دھیان ۔۔۔ ولیکن نہایت تھا میں سخت جان
لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ ۔۔۔ کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
پھرا ناتواں میں بہت در سے ۔۔۔ کہ نزدیک تھا عالمِ گرد سے
غلط کاریِ وہم کچھ کم ہوئی ۔۔۔ وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی

۲؎ مار ڈالتے ہیں

وہ صورت کا وہم ایسی دیوانگی — لگی کرنے در پر وہ بے گانگی
پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی — نہ دو دو پہر منھ لگانے لگی
نہ دیکھے مری اور اس پیار سے — غریبانہ سر مارے دیوار سے
کہیں ٹک تسلی کہیں بے قرار — کہیں شوق سے میرے بے اختیار
کہیں واسطے میرے روتی ہے خون — کہیں دست زیرِ زنخ ہے ستون
کہیں دل کو اپنے دکھاوے مجھے — مری بے وفائی جتاوے مجھے
کہیں دست بر دل وہ رشکِ قمر — کہیں حسرت آلودہ مجھ پر نظر
کہیں بے دماغانہ سرگرمِ ناز — کہیں آتشِ شوق سے جانگداز
کہیں چشم گریاں سے دامان پاک — کہیں شوجگہ سے گریبان چاک
کہیں کام دل کی شکایت سے ہے — کہیں نقشِ دیوار حیرت سے ہے
کہیں مجھ سے کہتے ہی رخصت مجھے — کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے
کہیں لب پہ وہ شکوۂ خونچکاں — کہ ٹپکا کرے جس سے آزارِ جاں
کہیں وہ نگہ جس سے یہ پائیے — کہ یہ دردِ دل ہے تو مر جائیے
کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب — کہیں وہ طرح جس سے ہوجیے خراب
کہیں حرف زن اس طرح ناز سے — کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے
کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو — کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو
کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے — کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے
کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے — کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے
کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے — کہے تو کہ بیزار ہے جان سے
کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے — کہ شرمِ محبت سے محجوب ہے
کبھو بے قراری ہے اس رنگ سے — کہ پھرتی ہے سر مارنے سنگ سے

کبھو بے ادائی و دشنام ہی — کبھو باد کے ہاتھ پیغام ہی
کہ اے بے وفا آہ دل نرم کر — محبت کی بھی منہ سے کچھ شرم کر
کبھو وہ تبختر کہ پروا نہیں — کبھو کیونکہ کہیے کہ سودا نہیں
کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد — کہ اے بے وفا حرفِ من یاد باد
کہ ظاہر ہیں میر اب تو آنا گیا — کہ وہ دوستی کا زمانا گیا
غرض نا اُمیدانہ کر اک نگاہ — وہ نقشِ توہم گیا سوئے ماہ
نہ آیا کبھو پھر نظر اُس طرح — نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اُس طرح
مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں — کبھو وہم سا عالمِ خواب میں
دلِ خوں پذیرِ وصالِ دوام — رہے خواب میں روز و شب صبح و شام
اگر وصل خوابِ فراموش تھا — و لیکن وہی خواب کا جوش تھا
پلک سے پلک آشنا ہی وہی — ز خود رفتگی کی ادا ہی وہی
کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں — رگِ خوابِ دل ہی کفِ شوق میں
جو بیٹھا ہوں خوابِ گراں ہی مجھے — وہ غفلت جہاں در جہاں ہی مجھے
خیال اُس کا آوے کہ سُن ہو رہوں — تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں
مجھے آپ کو یوں ہیں کھوتے گئی — جوانی تمام اپنی سوتے گئی
دکھایا نہ اُس مہ نے رو خواب میں — نہ دیکھا پھر اُس کو کبھو خواب میں
بہت بیخود و بے خبر ہو چکا — ہم آغوشِ طالع بہت سو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

ساقی نامہ

(۸)

ہے قابلِ حمد وہ سرانداز — جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز
اس کو مئے حسن نے چھکایا — ہستی کا نشہ اُسی سے پایا
پی اُن نے شرابِ خود پرستی — طاری ہوئی اس پہ زورِ مستی
وہ مستِ شرابِ ناز ہے فرد — خورشید ہے اس کا جام پرورد
ہے گردشِ چشم اُس سے افسوں — پھر جائے ہے جس کے ساتھ گردوں
ظلمت ہے دوئی کی تجھ سے احول — آخر ہے وہی وہی ہے اوّل
عالم ہے قرابۂ مئے خام — ہے دورِ سپہر گردشِ جام
مشہورِ جہاں جو کیف کم ہے — بے نشہ جو ہووے تو ستم ہے
وہ مستِ نیاز ہے حرم میں — وہ رفتۂ ناز ہے صنم میں
ہے آبِ رخ زمانہ اُس سے — روشن ہے تمام خانہ اُس سے
مینا میں جو سرکشی ہے وہ ہے — صہبا میں جو دل خوشی ہے وہ ہے
شمشاد ہے سرفراز اس سے — گل دیدۂ نیم باز اس سے
خوگر اسے نازپیشگی[1] ہے — وہ ہے کہ جسے ہمیشگی ہے
جو عکس پڑا ہے جامِ مے میں — آتی ہے صدا اسی کی نے میں
ہے جلوہ گری میں یاں بصد ناز — وہ مست گزارۂ سرانداز
سو رنگ ہیں اس کی یاد رکھ تو — ہر جلوے سے دل کو شاد رکھ تو
عالم میں جو کچھ نمود میں ہے — ہر لحظہ اُسی سجود میں ہے
کر یاد اُسی کو اور مے پی — جیتا رہے کوئی دن تو خوشی جی

[1] ناز پیشہ ہونا

اب روئے سخن چمن کو کریئے / مینائے دل اور مے سے بھریئے
آئی ہے بہار مے گساراں / پھولے ہیں چمن میں گل ہزاراں
آئی ہے بہار وہ خیاباں / بے لطف ہوا سے گل بداماں
آئی ہے بہار دیدہ کیشاں / ہے توبہ بادہ دل پریشاں
آئی ہے بہار مرغ گلزار / کرتا ہے نوائے سینہ افگار
لایا ہے بزور اس کا نالہ / مجھ کو بھی برائے سیر لالہ
ساقی جو کروں میں بے ادائی / معذور رکھ اب بہار آئی
گل باد صبا کے تا کمر ہے / دامان بلند ابر تر ہے
غنچے کی گلابیاں بھری ہیں / تکلیف کی منتظر دھری ہیں
ظالم مے ناب دے ہوا ہے / ایک جرعہ شراب دے ہوا ہے
ہر سر میں ہے شور فصل دے کا / چھکے ہے ہوا سے رنگ مے کا
اطراف چمن کھلا ہے لالہ / ہر پھول شراب کا ہے پیالہ
آتا ہے چمن پہ ابر جوشاں / آب رخ کار سبز پوشاں
تحریک نسیم دم بدم ہے / تکلیف ہوائے گل ستم ہے
ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی / اٹھتے ہیں بصد سیاہ مستی
بوندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا / رنگ گل و لالہ زور چمکا
ہے گل کی ہوا سبو کشی میں / بلبل کا دماغ بو کشی میں
ہر شاخ ہے شور جام در دست / نرگس ہے کسو کی نرگس مست
ہے رنگ ہوا کا آفتابی / جھومے ہیں نہال جوں شرابی
ہے سرو جوان نشہ در سر / لوٹے ہے روش پہ سبزۂ تر
چشمک کرے ہے حباب جو کا / یعنی کہ ہے دور اب سبو کا

ساقی قدحے کہ ذوقِ گل ہے	مطرب غزلے کہ فصلِ گل ہے
ہو صرفِ شراب کاش ساقی	یہ شیشۂ عمر ہے جو باقی
بے ساغرِ مے خناک ہے جینا	رکھتا ہے شکون شراب پینا
لا بادۂ کہنہ سال نو ہے	سجدہ یہی بابتِ گرو ہے
دروازۂ میکدہ کھلا ہے	ہر پیر و جواں کو الصلا ہے
اینڈے ہے ہر ایک مست جوں تاک	لیتے نہیں نام دامنِ پاک
ہر غنچہ جام زیرِ سر ہے	ہر گوشے میں عالمِ دگر ہے
مستیِ نگاہ عقل دشمن	خوبیِ خرام مرد افگن
کہتے گئے صاحبِ کرامات	ہم بھی نہیں قابلِ خرابات
جو لوگ کہ اس جگہ سے اُٹھے	کب حلقہ و خانقہ سے اُٹھے
یاں پیتے ہیں جام بیخودی کا	ہے دور تمام بےخودی کا
مستی سے ہر ایک صبح صدبار	خورشید کا سر ہے اور دیوار
ہے قابلِ سیرِ خرقہ پوشاں	دریا دلیِ شراب نوشاں
ان لوگوں کی ہر کمینہ صف میں	کشتی ہے شہ و گدا کے کف میں
ہر کوچے میں رہتی تھی منادی	تا رسمِ خردوری اٹھا دی
آزاد شد ایک مقام ہے گا	وہ مرتبہ یاں مدام ہے گا
گو پُر ہے یہ دور پر کہاں تک	اک لغزشِ پا ہے یاں سے واں تک
بے خود ہو کہ یہ حجاب اُٹھے	دل یاں سے کہیں شتاب اُٹھے
پہونچیں ہیں فنا کو بیخودی سے	پاتے ہیں خدا کو بیخودی سے
پی جرعہ و ہوش کو دعا کہہ	ہر بادہ فروش کو دعا کہہ
جوشش میں ہے بادۂ کہن سال	عبرت ہو جسے خوش اُس کا احوال

لہ لائق گرویدگی

اب دل میں مرے بھی جوش آیا — اب وقتِ وداعِ ہوش آیا
کھینچوں میں کہاں تلک دمِ سرد — ساقی وہ شرابِ شعلہ پرورد
وہ داروئے دردِ بے حضوراں — وہ مایۂ نورِ چشمِ کوراں
سرمایۂ عمدہ جاودانی — یعنی وہی آبِ زندگانی
وہ میوۂ خوش رسیدہ بارے — وہ عیشِ دلِ گزیدہ[۵۱] بارے
آئینۂ حسنِ خود پسنداں — زینت دہِ عنبریں کمنداں
وہ رنگِ رخِ بہار یعنی — وہ بادۂ خوش گوار یعنی
یاقوت گداز دادۂ عشق — یعنی کہ وہ جامِ بادۂ عشق
وہ لطف ہوا وہ سیرِ مہتاب — وہ شعلۂ غوطہ خوردہ در آب
وہ کامِ دلِ سبو بدوشاں — یعنی کہ وہی شرابِ جوشاں
وہ موجبِ دل خوشی کہاں ہے — وہ داروئے بے ہشی کہاں ہے
وہ جس کی طرف کو ہے تہ دل — یعنی وہ ہے شیشہ ماہ منزل
وہ آتشِ تیز آب آمیز — وہ عربدہ جو وہ فتنہ انگیز
وہ مقصدِ جانِ نا امیداں — وہ روسیہیِ روسفیداں
وہ رونقِ کارگاہِ شیشہ — وہ شوکتِ بارگاہِ شیشہ
وہ جس سے ہو توبہ مو پریشاں — وہ جس سے ہو گفتگو پریشاں
وہ دامنِ خشک جس سے جل جائے — ثابت قدموں کا پاؤں چل جائے
وہ سرخیِ چشمِ خوب رویاں — اسبابِ خرابیِ نکویاں
وہ دلبرِ خود سر و شلائیں[۵۲] — وہ رہزنِ راہ دین و آئیں
وہ جس سے غبارِ دل سے دھوؤں — مینا کے گلے سے لگ کے روؤں
مستی کی مجھے بھی خواہشیں ہیں — اس عقل سے دل کو کاہشیں ہیں

۵۱ برگزیدہ پسندیدہ ۵۲ شوخ

لا اس کو جو آستین جھاڑوں
پھر ہاتھ چلے تو جیب پھاڑوں

بے ہوش شراب ناب رہیئے
یوں تا بکجا کباب رہیئے

ہی مستی بے خودی ضروری
کھل جائے مقام بے شعوری

دل غم سے بھرا ہی زور میرا
تا عرش گیا ہی شور میرا

ہی دل میں کہ گل کی اور رو[1] ہو
شیشہ ہو بغل میں اور تو ہو

ہر گام پہ لغزش قدم ہو
تکلیف شراب دم بدم ہو

جب سجدہ کناں ہوں صبح خیزاں
جب کا کل صبح ہو پریشاں

جب نکلے ستارۂ سحر گہ
کر نعرۂ الصبوح یک[2] رہ

ہی ذوق شراب صبح گاہی
بے لطف نہیں ہی روسیاہی

جب نشہ کی کچھ ترنگ آوے
مستی مجھے باغ میں لٹاوے

شیشہ مرے موہنہ کو تو لگادے
کر ایسی نگاہ جو چھکادے

جب بے خودی تمام آوے
سر پر مرے ہوش رو کے جاوے

رخصت ہی تجھے کہ میں نہ ہوں گا
بے ہوش وخرد ہی پھر رہوں گا

بیٹھا تو کروں گا شکر تیرا
ہو ورنہ قبول عذر میرا

مقولہ

کیا میر شراب تو نے پی ہی
بے ہودہ یہ گفتگو جو کی ہی

یا آب سیہ ترے قلم نے
یہ تجھ سے عجب کیا ہی ہم نے

تو کاہے کو اتنا ہرزہ گو تھا
کب در گرو شراب تو تھا

بس موسے زبان اب نہ تر کر
مستی سخن پہ ٹک نظر کر

ہی نشۂ سامعہ دوبالا
پھر حرف نہ جائے گا سنبھالا

[1] گل کی طرف منہ ہو۔ [2] ایک بار

دنیا

(۹)

سُنو ای عزیزانِ ذی ہوش وعقل
کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہی نقل

پیمبر ہو شہ ہو کہ درویش ہو
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہو

کہوگے کہ آگے تھا کہتا کوئی
نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی

بجا[۱] ہی کیا کوسِ رحلت تمام
کنھوں نے نہ سمجھا سُنا یاں مقام

یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں
جہاں جملہ ہی ایک بزمِ رواں

جسے دیکھو چلنے کا گرمِ تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود و باش

گدا ہو کہ ہو شاہِ عالی تبار
تہِ خاک سب کا ہی دار القرار

نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہوگئی
وہ رنگینیِ باغ کیا ہوگئی

ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر
پریشاں ہوئے مرغِ گلشن کے پر

پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا
چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا

گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ
رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ

وہی راکھ ہو کر اگر آگ تھی
رکن ہی جہاں باد کی لاگ تھی

نہ جدول[۲] رہے گی نہ سروِ رواں
گلستاں کہائیں گے ہو کا مکاں

زمیں کا رہے گا ہی کیا سبھاؤ
لپیٹ جائیں گے آسماں جیسے تاؤ[۳]

سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب
چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب

جہاں ایک ماتم سرا ہی عجب
نہیں جائے باش اور جا ہی عجب

بھلا جی کے جانے کا کیا ہی بیاں
عیاں ہی کہ کہتے ہیں جاں کو رواں

جوانی گئی موسمِ شیب ہی
شہود ایک دو روز کو[۴] غیب ہی

۱ کوچ کا نقارہ بجا مقام یعنی قیام کا نہیں بجا ۲ روش ۳ کاغذ کا تختہ ۴ یعنی میں

ہنسوں کیونکہ ہستی ہیں دنداں نما
کہ ہو جائے دنداں ہی دنداں[1] نما

گیا شور سر سے جھکا ہی بہت
گئی وا شداب دل رکا ہی بہت

نہ وہ ذائقہ ہی نہ وہ ہی مشام
مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح شام

کریں لمس کیا ہر گھڑی ہی صداع[4]
نہیں لذت اکل و شرب و وقاع[5]

بلا ارتعاش تن زار ہی
ہر ایک عضو چلنے کو تیار ہی

ہوا حافظہ بس کہ نسیاں کا صرف
نہیں یاد آتا ہی دوشینہ حرف

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
کہوں کیا گزرتی ہی خاموش ہائے

نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہی
سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہی

نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
کسے ذوق صحبت کہاں وہ دماغ

نہ کچھ یو نہیں عینک نظر چڑھ گئی
بصارت کی بے طاقتی بڑھ گئی

نہ رکھیے جو عینک نہ آوے نظر
کہے تو کہ اعمی ہیں ہم بے بصر

رہیں دیکھ منہ حرف زن ہو حریف
رہا سننے کے گوش نہ سمع شریف

صد افسوس لطف سماعت نہیں
صدا دور سے جیسے آوے کہیں

شباب آہ داغ جگر دے گیا
قد خم زمیں کی طرف لے گیا

نہ کم زور بازو بہت کم ہوا
جھکا سر سو زانو کا ہمدم ہوا

جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی
سفیدی مو سے سحر ہو گئی

بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار
کرے کون خوباں سے بوس و کنار

جو یہ چال ہی جا رہے ہیں ہم اب
دموں[7] پر غرض آ رہے ہیں ہم اب

کھڑے ہوں تو تھرائے ران و ساق
جئیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہی شاق

جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے
تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے

اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم
یہ سوچو[8] تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم

---

[1] دانت کھولکر [2] مسوڑے [3] دانت کھولنے والے [4] درد سر [5] ہم صحبتی۔ یکجائی [6] قابل [7] کچھ سانس ہی باقی ہیں [8] زبان حال

کہے میں نہیں اپنے تک پاؤ دست — کیا خاک میں مجھ کو پیری نے پست
جو بازو ہیں اپنے سو بازو نہیں — اگر منھ کو دیکھو تو وہ رو نہیں
بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور — وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور
جسد ناتواں جائے مہمان تنگ — سخن منھ پر آوے وداعی کے رنگ
لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ — در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
شکن جلد میں دل کو پژمردگی — غریزی حرارت میں افسردگی
برودت بہت جسم میں آگئی — مزاجی تھی گرمی سو ٹھٹرا گئی
چھڑکتا رہوں منھ پہ میں آب کاش — کہ ہوتا رہے روح کا انتعاش[۱]
وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے — پھر اٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے ہے
سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا — لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

قلم رکھ دے کر میر ختم کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

۱؎ بیماری سے صحت

جھوٹ

(۱۰)

ای جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دَور ہی
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہی

ای جھوٹ تو شعار ہوا ساری خلق کا
کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہلِ دول کا

ای جھوٹ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہی
ای جھوٹ تو غضب ہی قیامت ہی قہر ہی

ای جھوٹ رفتہ رفتہ ترا ہو گیا رواج
تیری متاع باب ہی ہر چار سو میں آج

ای جھوٹ کیا کہوں کہ بلا زیر سر ہی تو
ای جھوٹ سچ یہ ہی کہ عجب فتنہ گر ہی تو

ای جھوٹ کب ہی عرصہ میں تجھ سا حریف اب
تیرے ہی حکم کش ہیں وضیع و شریف اب

ای جھوٹ تیرے شہر میں ہیں تابعیں سبھی
مر جائیے کیوں نہ کوئی وے بولیں نہ سچ کبھی

کہنے سے آج ان کے کوئی دل شاد ہو
فردا کہیں تو اس سے قیامت مراد ہو

وعدے گھڑی کے پہروں کے سب آزما چکے
برسوں تک انتظار کیا جی ہی جا چکے

ای جھوٹ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں
رکھتا ہی جیسے غنچہ زباں تو تہ زباں

یوسف کہ تھا نبی و صداقت شعار تھا
پھر حسن ظاہری سے بھی باغ و بہار تھا

پایانِ کار تیرے سبب چاک پیرہن
زنداں میں جا کے برسوں رہا چھوڑ کر وطن

ای جھوٹ تو تو ایک دلاویز ہی بلا
آشوب گاہ تجھ سے زمانہ سدا رہا

کس جاں کنی سے کوہ کنی کوہ کن نے کی
تصویر کھو د شیریں کی پیش نظر رکھی

نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے
اب صبح و شام غنچۂ مقصودِ دل کھلے

دلالہ کے تو پردے میں آ کام کر گیا
دو باتوں میں وہ عاشق دل خستہ مر گیا

ای جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اُٹھا کیے
ہنگامۂ و فساد ہی ہر سو رہا کیے

ای جھوٹ راستی سے نہیں گفتگو کہیں
کہنے کو ہاں کہیں ہی حقیقت میں ہی نہیں

ای جھوٹ اس طرح ہیں بہت جی سے جا چکے — وعدوں میں آہ لوگوں کے وعدے ہی آ چکے

ای جھوٹ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش — ہی تنگ جھوٹ بولنے سے عرصۂ تلاش

سر دار جنہیں سے سب متعلق ہی کار و بار — سچ بولنا ہی اس کے تئیں سخت ننگ و عار

پھر سب مدارِ کار دروغی و مفتری — صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

مشکل حصول کام ہی یاں حاصل کلام — باتوں ہی باتوں کام ہو اخلق کا تمام

ای جھوٹ دل مرا بھی بہت دردناک ہی — ان کاذبوں سے صبح نمط جیب چاک ہی

گھر کا حال

(11)

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال
اس خرابے میں میں ہوا پامال

گھر کا تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے

کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ
کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چار دیواری سو جگہ ہے خم
ترننک ہو تو سوکھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا کہیے مینہ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اس چلکش کا علاج کیا کریئے
راکھ سے کب تلک گڑھے بھریئے

جا نہیں بیٹھنے کو گھر کے بیچ
ہے چلکش سے تمام ایواں کیچ

آنکھیں بھر لا کے یہ کہیں ہیں سب
کیونکہ پردہ رہے گا یارب اب

جھاڑ باندھا ہے مینہ نے دن رات
گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات

بادیں کانپتی ہیں جو تھر تھر
اِن پہ رہّا رکھے کوئی کیونکر

کیچ لے لے کے بارے چھوپا ہے
چھوپنا کاہے کا ہے تھوپا ہے

جسکو پھر پر چھتی بھی ہے ہی نہیں
ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں

ڈھانکو دیوار یا اُٹھا رکھو
یا ہمارے لئے بچھا رکھو

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق
سو شکستہ تر از دلِ عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک

کہیں گھوسوں نے کھود ڈالا ہے
کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا
شور ہر کونے میں ہے مچھّر کا

کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے — کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کوئی ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں — پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہی — جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہی
آگے اس حجرے کے ہی اک ایوان — وہی اس تنگِ خلق کا ہی مکان
کڑی تختے سبھی دھویں سے سیاہ — اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہی — کوئی دا سا کہیں سے چھوٹا ہی
دب کے مرنا ہمیشہ مدِّ نظر — گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مٹی تودہ جو ڈالے چھت پر ہم — تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم
اینٹ مٹی کا ڈر کے آگے ڈھیر — گرتی جاتی ہی ہولے ہولے منڈیر
کیونکہ ساون کٹے گا ابکی بار — تھرتھراوے بھنبیری سی دیوار
ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب — اڑ بھنبیری کہ ساون آیا اب
تیتری یاں جو کوئی آتی ہی — جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہی
نہیں وہ زاغ چار پاؤں پھرا — ایک کالا پہاڑ آن گرا
مٹی اس کی کہیں کہیں سے کھسکی — جی ڈبا[۵] اور چھاتی بھی دھکی
سان کر خاک لگ گئے دو چار — بارے جلدی درست کی دیوار
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے — برسے ہی یک خرابی گھر در سے
ایک چھپر ہی شہرہ دلّی کا — جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا
بانس کی جا دیئے تھے سرکنڈے — سووے مینہوں میں سب ہوئے ٹھنڈے
گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب — پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب
مینہ میں کیوں نہ بھیگئے یکسر — پھوس بھی تو نہیں ہی چھپّر پر
واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا — یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

۵ بجائے ڈوبا

ٹھیکے دو چار جا تو بند کروں
بیچ کوئی لڑاؤں تفنگ[1] کروں

یاں تو جھانکے ہزار ہیں تنہا
کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بس کہ بد رنگ ٹپکے ہی پائی
کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
کوئی سمجھے ہی یہ کہ خیلا ہوں

پوچھ مت زندگانی کیسی ہی
ایسے چھپر کی ایسی تیبی ہی

کیا کہوں جو جفا چلکش سے ہی
چارپائی ہمیشہ سر پہ رہی

بوریہ پھیل کر بچھا نہ کبھو
کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو

جنس اعلےٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے ہٹ رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہی سو بھی
چین پڑتا نہیں ہی شب کو بھی

سب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں

کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہی
سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہی

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ہاتھ تکیے پہ گہ بچھونے پر
کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلا پا جو پائینتی کے اور
وہیں مسلا کرا ایڑیوں کا زور

تو شتاب ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹ
ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

ایک ہتیلی میں ایک گھائی میں
سیکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیے
کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے

دو طرف سے تھا کتوں کا رستا
کاش جنگل میں جا کے میں بستا

ہو گھڑی دو گھڑی تو دُتکاروں
ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں

چار جاتے ہیں چار آتے ہیں
چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز
کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

[1] بجائے فن۔ چال

وہ جو ایوان[۱] تھا حجرے کے آگے
اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے

کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا
پانی جڑ جڑ میں اس کی بیٹھ گیا

کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا

میں تو حیران کار رہتا اپنا
کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا

اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر
خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر

چرخ کی کجروی نے پیسا تھا
پر خدا میرا مجھ سے سیدھا تھا

کتنے اک لوگ اس طرف دھائے[۲]
یا ملک آسمان سے آئے

مٹی لے لے گئے وہ ہاتھوں میں
کام نے شکل پکڑی باتوں میں

صورت اس لڑکے کی نظر آئی
ہم جو مردے تھے جان سی آئی

آنکھ کھولی اِدھر اُدھر دیکھا
اس خرابے کو بہ نظر دیکھا

قدرتِ حق دکھائی دی آکر
یعنی نکلا درست وہ گوہر

داشت کی کوٹھڑی میں لا رکھا
گھر کا غم طاق پر اُٹھا رکھا

مومیائی کھلائی کچھ ہلدی
فرصت اس کو خدا نے دی جلدی

غم ہوا اُن کے دوست داروں کو
پھر بندھا یہ خیال یاروں کو

کہ مری بود و باش یاں نہ رہے
گو تصرف میں یہ مکاں نہ رہے

شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں
چار ناچار پھر رہا میں وہیں

اب وہی گھر ہے بے سروسایہ
اور میں ہوں وہی فرومایہ

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس
خواب راحت ہے یاں سے سو سو کوس

قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں
رات کے وقت گھر میں سوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہی کاہے کا نام ہے گھر کا

۱؎ نشستگاہ ۲؎ نکل پڑے۔ دوڑ کر آگئے۔

ہجو خانۂ خود

(۱۲)

جسمِ خاکی میں جس طرح جاں ہے — اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے
ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں — زندہ در گور ہم کئی تن ہیں
ہے جو سرکوب اک بڑی دیوار — واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار
بخت بد دیکھ سارے پرنالے — اس کے معمار نے ادھر ڈھالے
اب جو آیا ہے موسمِ برسات — دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
صحن میں آب نیزہ بالا ہے — کوچہ موج ہے کہ نالا ہے
مینہ میں گھر کے پانچ چھ چھپر — ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر
پر تنک تنکے تھے کچھ ایک نئے — سو وے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے
دل ہے کچھ مکڑیوں کا احسان مند — کہ جنھوں نے کئے ہیں جھانکے بند
پھوس کچھ ہے کہیں سو آتا ہے — بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے
اڑ گئی گھاس مٹی ہے والا[1] — ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا
اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے — ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہے
کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو — باندھتا ہوں مچان رہنے کو
بند جھانکوں کو کیجیے تا کے — یاں تو اک آسمان ٹوٹا ہے
ٹھیکے دینے کو جا اڑے ہیں ہم — سر پہ ٹھٹر لیے کھڑے ہیں ہم
ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپر کے — بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے
تا گلو سب کھڑے ہیں پانی میں — خاک ہے ایسی زندگانی میں
اب تو اپنا بھی حال ہے بدتر — سر پہ گٹھری ہے تس پہ ہے چھپر

[1] باریک ریشمی کپڑا

پانی بہہ کر جھکا جو ہر دالان　　سر پہ رہتا ہے طرہ ایوان
چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار　　جیسے چھاتی ہو عاشقوں کی فگار
متصل ٹپکے ہے نہ باراں ہے　　گریہ زارِ سوگواراں ہے
گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے　　چھت بھی بے اختیار روتی ہے
مینہ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا　　کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
واسطے پایانِ کار ٹوٹ گئے　　طاقچے بھر رہے تھے پھوٹ گئے
بہہ گئے کوئی تختے ڈوب گئے　　غرض اجزائے سقف خوب گئے
موج خشتی ستون میں بیٹھی　　جان غمناک خون میں بیٹھی
لے گیا پیچ و تاب پانی کا　　کوٹھڑی تھی حباب پانی کا
یوں ڈھہا گھر کہ بارِ خاطر تھا　　آہ کس کا غبارِ خاطر تھا
اکھڑی دہلیز سب منڈیر گری　　لہر پانی کی جھاڑو دیتی پھری
ساری بنیاد پانی نے کاٹی　　اینٹ کے گھر کو کر دیا ماٹی
جھک گئے سب ستون در بیٹھا　　وہی چھپر کھڑا ہے گھر بیٹھا

برسات کی شکایت

(۷۸)

کیا کہوں اب کے کیسی ہے برسات
جوشِ باراں سے بہہ گئی ہے بات

بوند تھمتی نہیں ہے اب کے سال
چرخ گویا ہے آب در غربال

وہی یکساں اندھیر برسے ہے
آسمان چشم وا کو ترسے ہے

ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں
تارے ڈوبے ہوئے اُچھلتے نہیں

آب میں کوئی بولتا ہی نہیں
آسماں دیدہ کھولتا ہی نہیں

چرخ تک ہو گیا ہے پانی جو
ماہ و ماہی ہیں ایک جا ہر دو

لے زمیں سے ہے تا فلک غرقاب
چشمۂ آفتاب ہیں گرداب

خشک بن ابکی بار سبز ہوئے
موشِ دشتی کے خار سبز ہوئے

ابر کس کس سیاہ مستی سے
ہوتے جا[۱]ہیں بلند پستی سے

ابر کرتا ہے قطرہ افشانی
پانی پانی رہے ہے بارانی

تنگ آبی سے جان مت اغراق[۲]
ڈوبنے پر ہے کشتیِ آفاق

عقل مینہوں نے سب کی کھوئی ہے
بات باراں نے یاں ڈبوئی ہے

کیسا طوفان مینہ چھایا ہے
زخم دل نے بھی اب اُٹھایا ہے

بیٹھے اُٹھتے نہیں ہیں بام و در
یہ خرابی ہے شہر کے اندر

سقف آماج بوند پیکاں ہے
مینہ ہے یا کہ تیرِ باراں ہے

جیسے دریا اُبلتے دیکھے ہیں
یاں سو پرنالے چلتے دیکھے ہیں

ابر رحمت ہے یا کہ زحمت ہے
ایک عالم غریقِ رحمت ہے

لے گئے ہیں جہان کو سیلاب
نقشہ عالم کا نقش تھا برآب

۱ جاتے ہیں ۲ مبالغہ

نہ ہی جلسہ نہ ربطِ یاراں ہی — شہر میں ہی تو باد و باراں ہی
روز و شب یاں ہمیشہ جھمکا ہی — اِن دونوں رنگِ برق چمکا ہی
وسعتِ آب پوچھ مت کچھ یار — کوچے موجوں کے ہو گئے بازار
شعر کی بحر میں بھی ہی پانی — بہتی پھرتی ہی اب غزل خوانی
لائی بارندگی کی چالاکی — آبِ خشک گہر پہ تمنا کی
مست ہو ہو گئے ہیں مستِ شراب — غوطے کھاتے پھریں ہیں عالِم آب[1]
مستی ہی اب جو چاہیں سیرآبی — بطِ مے تو ہوئی ہی مرغابی
دشتِ غم اس قدر یہ طغیاں ہی — کہ ہراک گوشے بیچ طوفاں ہی
جزر و مد جس کا تا فلک جا ہی — جو ہی تالاب قہر دریا ہی
ہر طرف ہیں نظر میں ابرِ سیاہ — پانی ہی جس طرف کو کریئے نگاہ
سیلہا در رکاب دیدہ ہاست — چشم تا کار می کند دریاست
خضر کیونکر کے زیست کرتا ہی — آبِ حیواں میں پانی مرتا ہی

کیا لکھے میر مینہ کی طغیانی
ہو گئی ہی سیاہی بھی پانی

[1] پانی کی حالت جاننے والے۔

برسات کا سفر

(۱۴)

ابر ہونے لگے سفید و سیاہ
پانی رستوں میں کیچ ساری راہ

بیچ میں ہوتے کچھ اگر اسباب
منھ اُٹھانے کی جی میں ہوتی تاب

سو توکّل نہ ٹٹو نہ لوئی
سایہ گستر نہ ابر بن کوئی

ابر بھی بیکسی پہ روتا تھا
ابر ہی سر کا سایہ ہوتا تھا

آسماں آب سب زمیں سب کیچ
خاک ہے ایسی زندگی کے بیچ

شب کہ دریا پہ ہو کے راہ پڑی
پانی کی سطح پر نگاہ پڑی

لُجّی[1] لطمی کا کیا کہوں میں اوج
باتیں کرتی ہے آسماں سے موج

ہوش جاتا تھا دیکھ جوشِ آب
گوش کرتا تھا کر خروشِ آب

آب تہ دار اور تیرہ بہت
لہر اُٹھتی جو تھی سو خیرہ بہت

پانی پانی تھا شور سے طوفان
دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان

ہمرہِ موج سیکڑوں گرداب
ساتھ تھی صد تری کے چشمِ حباب

ناؤ میں پاؤں ہم نے ہاسے رکھا
خوف کو جان کے کنارے رکھا

جزر و مد سب حواس کھوتا تھا
خضر کا رنگ سبز ہوتا تھا

موج اُٹھنے لگی جو طوفاں زا
کچھ نہ آیا نظر سو عماں زا

کیا کہیں ڈوب ہی چلے تھے ہم
ناخدائی خدا نے کی اس دم

بلّی لگتی نہ تھی نہ کچھ بھی تھاہ
عقل گم کردہ لوگ تھے ہمراہ

ریلا پانی کا جب کہ آتا تھا
خوف سے جی ہی ڈوب جاتا تھا

خطرِ غرق سے تھی طاقت طاق
بیخودی سے ہوا تھا استغراق

[1] موجوں کے تھپیڑے

بہتے پھرتے تھے خضر کشتی پاس
غوطے کھاتے تھے حضرتِ الیاس

بد بلا سے تھے ہم کنارہ ہوئے
تھا خدا ہی تو چلے پار ہوئے

کسو درویش کا تھا یُمن قدم
جا کے پہونچے جو اس کنارے ہم

ورنہ اعمال نے ڈبویا تھا
گوہرِ جاں سے ہاتھ دھویا تھا

اُس کنارے کا جو اثر پایا
ہم طلاطم کشوں میں جی آیا

باؤ جنگل کی تند کچھ نہ رکاؤ
مینہ میں چل پڑے تو کانپے جاؤ

باؤ سی دن میں سائیں سائیں کرے
رات ہووے تو بھائیں بھائیں کرے

آس پاس اُس گڑھی کے آئی جھیل
گم تھے برسات میں طریق و سبیل

ایدھر اودھر اُتر کے پانی جاؤ
قہر ہی پھر جو ٹک بھی ہووے چڑھاؤ

اس سے واں کی ہوا بہت مرطوب
ہووے نزلہ زکام بے اسلوب

کتنے روزوں میں ہوتی ہو کھانسی
ایسی جیسے گلے میں دیں پھانسی

پھر وہ درجہ ہو جس میں ہووے دق
یہ کوئی نکلی ایک ثالث شق

نہ کوئی دادرس نہ وقت داد
مفت ہی ہم گئے تھے سب برباد

کیا کڈھب چرخ کج نے پھینکا تھا
پر خدا کچھ ہمارا سیدھا تھا

جنّے قدرت نمائی کی اپنی
اُس بلا سے رہائی کی اپنی

بس قلم ہو صریرِ تیزی تند
شور سے تو پڑا جہاں میں دُند

بد زبانی کا مجھ کو کب ہو دماغ
ایسی باتوں سے میں کیا ہو فراغ

ہو چکی صاحبوں کی فرمایش
چپ رہ اب ہو زمانِ آسایش

شادی نامہ

(۱۵)

ہی جہانِ کہن تماشا گاہ
آصف الدولہ کا رچا ہی بیاہ

آؤ ساقی کہ کد خدائی ہی
طبعِ نواب ادھر کو آئی ہی

نئے سر سے جواں ہوا ہی جہاں
عیش و عشرت کے محو خورد و کلاں

ہر طرف شہر میں ہی آرایش
رہرواں کی نہیں ہی گنجایش

شیشہ بازِ فلک ہی آتشباز
کہکشاں سے ہوا ہوائی ساز

ماہ سے ماہتاب کی ہی طرح
کس سے ہو لطفِ روشنی کی شرح

نہیں رستوں میں روشنی کے دیئے
نجم ہی چشم روشنی کے لیئے

شبِ شادی کی دھوم کیا بات
روزِ روشن تھی روشنی سے رات

دو طرف چھوٹتے جو ہیں گے انار
راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار

آؤ ساقی کہ جمع ہیں احباب
سب مہیّا ہیں عیش کے اسباب

لاوہ جوں آفتاب ساغرِ زر
آبِ گلرنگ سے لبالب کر

آج جھوما ہی ابرِ بخشش زور
کچھ نظر ہی تجھے ہوا کی اور

دستِ دستورِ ابرِ نیساں ہی
یعنی یکدست گوہر افشاں ہی

کر چمن زارِ دست و دل کی سیر
ہیں نہال آج آشنا و غیر

گل نمط دل شگفتہ سب کے کیئے
خلعتِ فاخرہ سبھوں کو دیئے

لا کہاں ہی وہ لالہ رنگ شراب
جس سے مستِ گذارہ ہوں احباب

آئے مطرب لیئے رباب و چنگ
کاڑھو منہ سے نوائے شیر[1] آہنگ

ہر طرف رقص میں ہیں گلرویاں
پائے کوباں ہیں سلسلہ مویاں

[1] شیر کلا وہ دودھ کے شیر یں اور شراب کے معنی ہیں بھی آتا ہی۔

شادمانی سے ہو نوائے دراز — دے بہار گزشتہ کو آواز
گل و لالہ سے چشم باز کرے — رنگ صحبت کو دیکھ ناز کرے
چھیڑ سازِ طرب نوا کے تئیں — باندھ آواز سے ہوا کے تئیں
وجد میں لا تو مے پرستوں کو — یاد دے ٹک سرود ستوں کو
آؤ ساقی کہ روشنی ہے خوب — محوِ آرایش آج ہیں محبوب
کاغذیں باغ کیا تماشا ہے — پھول کترا کہ گل ترا شا ہے
شیشہ شیشہ شراب ہے درکار — صحبتِ عیش کو چھکا یک بار
لالہ رنگِ رُخ نکویاں کو — مایۂ نازِ خوب رویاں کو
اُس پری کو نکال شیشے سے — رنگ مجلس میں ڈال شیشے سے
ہوکے سرمست۔ ہو تماشائی — حکم کش ہے سپہرِ مینائی
چھوڑ آئین بردباری کا — سیر کرلے ترک سواری کا
چل گلابی کو ہاتھ میں لے لے — ایک دم جام متصل دے لے
ہے سواری کی فیل کی وہ دھوم — جیسے ابرِ بہار آوے جھوم
آئے دولت سرا سے ہوکے سوار — لعل ناب و گہر ہیں صرفِ نثار
اک مہابت کے ساتھ فیل نشاں — آگے مانند کوہِ زر کے رواں
اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے — جیسے آویں جوان مد ماتے
جھول زربفت کی ہے ساری شب — روکشِ انجمِ فلک ہیں سب
پلٹنیں جاتی ہیں برابر یوں — صف ہو مژگانِ دلبران کی جوں
یال بستہ رکاب میں ہیں سرنگ — جن کے دیکھے کمیتِ چرخ ہے دنگ
خوش سواری و خوش جلو خوش راہ — باگ اُچکی تو پھر نہ ٹھہری نگاہ
گردنوں میں پڑی حمائل گل — ہیں جلو میں بصد شمائلِ گل

له یاد دہانی کر۔ سرو دبستاں یاد دہاں۔ سه تیزی و چستی میں لیے ترکتاز مشہور ہے۔ سه زرق برق لباس والوں کی وجہ سے راستہ [illegible]

تھا بہت تیزگام اسپِ خیال — رہ گیا دیکھ کر اُنھوں کی چال

بھئے پری زاد چھیڑے اُڑجاویں — آنکھ پھیرو تو کل سے مڑجاویں

کسمسانے میں باؤ سے آگے — ہاں کہے جیسے وہم جا لاگے

پھینکتے ہیں جو دستہ دستہ گل — رہ گزر میں ہیں رستہ رستہ گل

ساقیا دے وہ مے جو باقی ہے — شادی ایسی بھی اتفاقی ہے

ہو مبارک یہ جشنِ خوش انجام — دورِ گردوں بکامِ عیش مدام

ہولی

(۱۶)

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر — رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر
شیشہ شیشہ رنگ صرفِ بوستاں — صحنِ دولت خانہ رشکِ بوستاں
اُس چمن سے باغ پر گل سرخ و زرد — نکہتِ گل جھاڑے گی واں آکے گرد
پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر — لالہ و صد برگ سب باغِ نظر
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں — جیسے گلدستہ تھے جوؤں پر رواں
زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس — عطر مالی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی تھی پھوار — رنگ باراں تھا مگر ابرِ بہار
مرغِ گلشن گل رخاں کو جان پھول — بیٹھتے ہیں پاس آکر پھول پھول
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال — جس کے لگتا آن کر پھر منہ ہو لال
برگ گل رلواں اُڑاتے تھے عبیر — تھی ہوا میں گرد تا چرخِ اثیر[۱]
ٹٹیاں دریا کی باندھے دو طرف — کیا[۲] چراغاں آسماں کی ہو طرف
تھا جہاں تک آبِ دریا کا بہاؤ — واں تلک تھا آبِ دریا کا دکھاؤ
ایک عالم دیکھتا ہے دور سے — رات دن تھی روشنی کے نور سے
سوانگ کیا کیا بن کے آئے درمیاں — دیکھنے کا سوانگ تھا سارا جہاں
کیسی کیسی دیکھیں شکلیں نازیاں — سحر کرتے تھے کہ صورت بازیاں
کشتیوں میں جو دیئے بھر کر جلے — پانی میں شعلوں کے ریلے ہی چلے
منعکس تھے جو چراغاں تہ تلک — آب کی وسعت تھی بر نجم فلک
کیا ہوائی چھوٹنے کا ہے بیاں — دونو[۳] نب جیسے ستارے ہوں عیاں

۱ بلند ۲ ان ٹٹیوں کا مقابلہ آسمانی چراغاں کی روشنی نہیں کرسکتی ۳ دودم دار

گنج چھوٹے ایک سے روشن تھے جھاڑ
دو طرف جس طرح سے جھڑتی ہے باڑ

اک روش سے تھے ستارے چھوٹتے
ناگہاں جو ہو دیں تارے ٹوٹتے

دیکھے جاتے تھے چراغاں آب میں
شعلے تھے لہروں کے پیچ و تاب میں

ہر دو جانب چن گئے ناری انار
گلفشانی سے انھوں کی تھی بہار

ماہتابی اک طرف سے جو دغی
چاند سا نکلا ہوئے حیراں سبھی

آفریں صناع لوگوں آفریں
کیا لگایا باغ آکر کاغذیں

گل کتر کر پھول گل ہی کر دیئے
رنگ تازے کاغذوں میں بھر دیئے

متصل تو ہیں ستاروں کی دغیں
لوگوں کی آنکھیں فلک سے جا لگیں

دیکھیاں کیا کیا نہ شعلہ خیزیاں
تھیں ہوا میں سے ستارہ ریزیاں

عرصہ گل ریزی سے گلشن ہو گیا
چرخ ان تاروں سے روشن ہو گیا

داغیاں تو ہیں ہوائی ایک بار
پھیلے تارے آسماں میں بے شمار

کیا ہوائی باد میں لہرا گئے
تارے سانپوں کے سے من پھیلا گئے

کیا ہی آتش دستیاں وے کر گئے
شعلوں سے پانی کی لہریں بھر گئے

رحمت اے آتش زناں کیا لاگ ہے
کہ بساط آب دریا آگ ہے

ہولی

(۱۷)

آؤ ساقی شراب نوش کریں — شور سا ہی جہاں میں نوش[1] کریں
آؤ ساقی بہار پھر آئی — ہولی میں کتنی شادیاں لائی
شادیاں بے شگوں سراسر ہیں — کوچے سو شہر کے برابر ہیں
دستِ دستور ہی جو زر افشاں — پھر جہاں کہن ہوا ہی جواں
دونوں رستے عمارت خوش ہی — تازہ کاری شہر دلکش ہی
زور بازاری رنگ لائے ہیں — سارے رنگیں ستوں لگائے ہیں
جس طرف دیکھو معرکہ سا ہی — شہر ہی یا کوئی تماشا ہی
چشمِ بد دور ایسی بستی سے — یہی مقصد ہی ملکِ ہستی سے
لکھنؤ دلی سے بھی بہتر ہی — کہ کسو دل کی لاگ ایدھر ہی
آئین[2] بستہ ہوا ہی سارا شہر — کاغذیں گل سے گلستاں ہی دہر
ایسے گل پھولے ہیں جو صرفِ کار — راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار
بستہ آئیں دکانیں ہیں یکسر — جن میں سستی متاعِ لعل و گہر
میوۂ نورس درسیدہ بہت — گل خوش رنگ و بوے چیدہ بہت
شبِ شادی کو لڑکے ہوں جو سوار — لیں صغیر و کبیر بہرِ نثار
تختِ بہرِ زنانِ رقص کناں — چھنے رستوں میں بے چنیں و چناں
گلِ کاغذ سے شہر ہی گلزار — تو کہے آئی ہی بہار اے یار
ساقیا عیش کا ہو بزم آرا — سارے لوگوں میں جام ہی کو پھرا
جس میں [3] پاوے اس [4] پری کو دے — ورنہ شیشے کی شیشے میں کھلے

[1] نوش کے معنی شیریں بھی ہیں اس لیے شور کے مقابلے میں اس رعایت سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ [2] آراستہ، آئینوں سے مزین [3] ظرف [4] شراب

ہو گی مجلس جو مست آسایش | کون دیکھے گا لطف آرایش
آؤ ساقی قرار ہی باہم | کہ تماشا کناں پھریں خرم
زنِ رقاص پر نگاہ کریں | کسو ساڈے سے چل کے راہ کریں
کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ | کسو محبوب کو اُٹھا لیں ساتھ
کسو خوش رو کے منھ پہ منھ رکھ لیں | کنج لب کا کہیں مزا چکھ لیں
خوش تنوں سے کریں ہم آغوشی | کسو نازک بدن سے ہم دوشی
کہیں دو جام مے سے ہوں سرمست | جائیں گے تھوڑی دور دست بدست
مچلے بن جائیں گے کسو کو دیکھ | پھیر آگے کسو کے رو کو دیکھ
اب گلابی پئیں گے بھر بھر ہم | باقی ساقی پئیں گے پھر کر ہم
کہیں آرایش آ کے دیکھیں گے | کاغذیں باغ جا کے دیکھیں گے
کسو مہوش سے ہووں گے گلباز | کھینچیں گے ایک دو دم کے اس کے ناز
آؤ ساقی مئے دو آتشہ دے | اسی مے کا بغل میں شیشہ دے
گرم ہو جو دماغ انساں کا | لطف آوے نظر چراغاں کا
جس طرف دیکھیے چراغاں ہی | شیشہ و شمع ہی نمایاں ہی
باغ سے روشنی ہوئی ہی زیاد | ہی یہ ہنگامہ تا جلال آباد
شمع و فانوس کا بہت ہی ہجوم | شمع رنگوں نے کر رکھی ہی دھوم
لوٹیے ان گلوں کی اب تو بہار | گو کسو کے گلے کا ہو جیے ہار
ابتو اودھم ہی مچ گیا ہر سو | دارو پی کر پھریں چلیں ہم تو
تارے سے ہیں چراغ چار طرف | آسماں پر زمیں رکھے ہی شرف
غنچہ غنچہ دیوٹوں کو دیکھیں جہاں | کسو نو گل سے رکھیں صحبت واں
کہیں نوبت کو چل کے سنیے گا | نے کے بجنے پہ سر کو دھنیے گا

نوبتی خوش سلیقے سارے ہیں
نے نوازوں نے جان مارے ہیں

آج نوبت کے بجنے پر ہی رنگ
عقل ہوتی ہی سُن ٹکورے دنگ

جھانجھ کے سننے کی رہی ہی جھانجھ
صبح جوں تُوں کے ہم کریں ہیں سانجھ

بیچ میں ہولی آئی ہی ساقی
پھریئے سرخوش ہی تا بچے باقی

شیشہ شیشہ شراب اب پیجے
بلکہ خم منھ لگا کے سب پیجے

سیر کریئے کنارِ نہر و گشت
لالہ و گل کھلے ہیں تا سرِ دشت

انھیں پھولوں کے انعکاس سے آب
تو کہے لالہ رنگ سب ہی شراب

سبدِ گل ہوئی ہی ہر کیاری
ایک ہی گل زمیں زمیں ساری

درمیاں یک شجر نہیں بے برگ
ہی ہزارہ کہ لالۂ صدبرگ

جوش لالہ سے تا اُنیج و سنگ
شفقی ہو گیا ہوا کا رنگ

تخت کیونکر نہ ہو دماغِ خاک
دشت در دشت ہی گل تریاک

پھر لیا لب ہیں آب گیرِ رنگ
اور اُڑے ہی گلال کس کس ڈھنگ

پاس آتے ہیں مرغِ گلشن پھول
تھے وے دلبر گلاب کے سے پھول

پگڑیاں جامہ بھیگی سو سو ہیں
ان کو گلہائے تر کہیں تو ہیں

چھڑیاں پھولوں کی لبروں کے ہاتھ
سیکڑوں پھولوں کی چھڑی سے ساتھ

قمقمے بھر گلال جو مارے
مہوشاں لالہ رُخ ہوئے سارے

خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں
گل کی پتی ملا اُڑاتے ہیں

جشنِ نوروزِ ہند ہولی ہی
راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہی

عشق ہی اک گروہ آتش زن
دونوں رستے چراغ ہیں روشن

درِ دولت سے لیکے تا سرِ آب
ہی چراغ اور شمع ہی گی تا ب

پھر سرِ پل سے تا عمارتِ نو
جلتے ہیں مجتمع ویسے سو سو

[illegible]

آؤ ساقی پلا شراب ہمیں ۔۔۔ روشنی کی نہیں ہے تاب ہمیں
روشنی بھی ہے کوئی ہنگامہ ۔۔۔ سیر میں گرم ہو گیا جامہ
گرمی سے مشعلوں کی آئے تنگ ۔۔۔ دودِ مشعل ہے جائے کاہی رنگ
دو طرف سیم بندی کر دی ہے ۔۔۔ سونے روپے سے راہ بھر دی ہے
شمعیں لاکھوں کنول میں ہیں روشن ۔۔۔ زور پھولا ہے کاغذیں گلشن
واہ آتش زبانِ آتش دست ۔۔۔ دارو پی کر بھرو ہو کیسے مست
تو ہیں کیا ڈھالی ہیں ستاروں کی ۔۔۔ کھوئی رونق فلک کے تاروں کی
ماہ بھی چشمِ روشنی کے لیے ۔۔۔ ہے چراغاں ستارگاں سے کیے
گنج چھوٹے ہیں یا کہ بازچھڑی ۔۔۔ یا ہوائی ہے جگنیوں کی چھڑی
گل فشاں ہیں پڑی جو پھلجھڑیاں ۔۔۔ کھلتیاں ہیں دلوں کی گلچھڑیاں
چھوٹتے ہیں انار جہتابی ۔۔۔ رنگ ہیں دلبروں کے مہتابی
باؤ سے دو دیئے ہوئے گرماند ۔۔۔ دغیں مہتابیاں کہ نکلے چاند
آہ ساقی مجھے قرابہ دے ۔۔۔ در بغل شیشہ ساتھ اپنے لے
بحرِ بخشش کی لہر یاب آئیں ۔۔۔ زر و گوہر کی کشتیاں لائیں
ہے بلند اس کرم کا کیا پایہ ۔۔۔ دیتے ہیں خلعتِ گراں مایہ
کیا بچھا ہے فراغ دستر خوان ۔۔۔ جس پہ ہے خلق یک جہاں مہمان
کس کو اسباب یہ میسر ہیں ۔۔۔ ظرف سیمیں و جبہ زر ہیں
ہیں جو مہمان بادشاہ و گدا ۔۔۔ حرص دونوں کی سیر ہے یکجا
عمر و دولت ہو اس کی حد سے زیاد ۔۔۔ ہے اسی سے جہاں نشاط آباد

۱ اسم ۲ صفت ۳ سرپوش

صید نامہ اول

(۱۸)

چلا آصف الدولہ بہرِ شکار
نہادِ بیاباں سے اُٹھا غبار

روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ
لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ

طیور آشیانے سے جانے لگے
وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

سُن آوازِ شیرانِ نر ڈر گئے
پلنگ و نمر خوف سے مر گئے

جہاں ببر آیا نظر صید تھا
بیاباں اسی پہنٹ سے قید تھا

گئے مست ہاتھی مکانوں کو چھوڑ
دیئے پنجۂ شیر ٹیلیوں سے توڑ

نہ دیکھا نہ ہم نے سُنا یہ شکار
کہ بکری سا ہاتھی کو لیتے ہیں مار

پلنگانِ صحرا کے دل خوں کیے
نہنگانِ دریا ہوئے مرچیے

ہوئے لشکری جبکہ سرگرمِ گشت
مقید ہوئے مست فیلانِ دشت

گئے جانور دشت خالی رہے
بیاباں میں جھاڑے گئے تو کہے

عجب تر ہی یہ صید کرنے کا ڈھنگ
کہ چورنگ ہاتھی ہوئے بے درنگ

نہ چیتا نہ پاڑا نہ ارنا نہ شیر
ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر

درندوں کا پیدا نہ نام و نشاں
نہ شیرِ ژیان و نہ پیلِ دماں

گوزن اور ہرنوں کی کیا دیجے شرح
گئے شیر مارے سو کتوں کی طرح

گیا دشت در دشت شورِ شکار
ہوئے گرگ آہو کے اوپر سوار

ہرن چکتیوں میں رہے گھومتے
کھپے فیل بیلوں ہی میں جھومتے

برابر رہے گور و شیرِ ژیاں
برابر تھا دونوں کو وسواسِ جاں

گئے بیشتر چھوڑ نخچیر گہ
شغالوں کی روباہ بازی تھی یہ

کروں صیدِ ماہی کا کیا میں بیاں
کہ فیلوں پہ تھے تودہ تودہ رواں

پڑے سیکڑوں دام تالاب میں
نہ چھوٹی تنک خاک اس آب میں

نہ تیتر نہ طاؤس صحرا کے بیچ
نہ ماہی نہ مرغابی دریا کے بیچ

ہوا حائلِ راہ بحرِ عمیق
کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق

قریب آکے اتری پہ خائف تھی فوج
کہ بے ڈول اٹھتی تھی ہر ایک موج

مہیب اور آلودۂ خاک آب
بعینہ پھٹی آنکھ تھا ہر حباب

عجب لجہ خیزی بلا جوش پر
طلاطم قیامت لیے دوش پر

چلے بس تو کچھ کوئی چارہ کرے
مگر دیکھ ہی کر کنارہ کرے

تردد میں ہر اک کہ ہوں کیونکہ پار
کنارے پہ سرگشتہ گرداب وار

رواں آب ایسی روانی کے ساتھ
کہ جوں رفتگی ہو جوانی کے ساتھ

لگے پاؤں[۵۱] چلنے جہاں شور تھا
کہ کم آب میں بھی بڑا زور تھا

نمک خوار مجھ سے تو ہوں گے ہزار
نہ میرا بھی ہونا ہی یاں یادگار

غرض میر تا دورِ چرخِ بلند
رہے آصف الدولہ اقبال مند

کرے اس کا اقبال ہر لحظہ کام
نگونسار اس کے دشمن رہیں صبح و شام

صید نامہ دوم

چلا پھر بھی نوابِ گردوں شکار
اسد باؤ کے گھوڑے پر ہو سوار

روانہ ہوئی فوج دریا مثال
نہنگوں کی اب کھینچی جاوے گی کھال

گیا شور تا آسمانِ بریں
ہوئی گردِ افواج گردوں قریں

زمیں ہو گئی جائے خوف و خطر
فلک کو لگے دیکھنے شیر نر

۵۱ پاؤں اکھڑنے لگے۔

چڑھا بس کہ دریائے فوج گراں — اُتر ہاتھیوں کی گئیں مستیاں
دبے چپ لگا چلنے بھیڑوں کی چال — پریشاں ہے گرگ بغل زن کا حال
پلنگوں نے کہسار سے راہ لی — نہنگوں نے دریا کی جا تھاہ لی
بکھیرے جو تھے دام سے چھا گئے — کشف[۵۱] نیچے ڈھالوں کے گھبرا گئے
درندے پرندے چرندے کھپے — گزندوں کے منھ گرد نیچے ڈھپے
تلف جانور ہیں جہاں کے تہاں — گوزن اور گورا اور آہو کہاں
رہے گور یک شاخ و یکسو غزال — تزلزل میں ہیں کیا شجر کیا نہال
شغال اور روباہ و خرگوش سے — نہیں بحث کچھ یہ ہیں بے ہوش سے
کوئی شور سن سن کے گھبرائے ہے — کوئی کان ڈالے چلا جائے ہے
کوئی ڈھونڈھتا ہے بیاباں میں جھاڑ — کوئی چاہے ہے پھاند جاؤں پہاڑ
کہ شاید یہ اودھر ہو کل نکل — کوئی دن جیئے اس بلا سے نکل
پھرے مضطرب ہو کے شیرِ عریں — کہ بیشوں میں تھے پاکماں پاکمیں
اگر خرس تھا مفتر و بد معاش — لگا موش خانے کی کرنے تلاش
وگر ببر ہے پیش و پس ہے نگاہ — نہیں سوجھتی بے حواسی سے راہ
مبادا شکاری سگانِ رکاب — گریں آکے مجھ تک بھی پہنچیں شتاب
ہوا آب زہرہ وہ شیری گئی — جگر ڈر سے ہے خوں دلیری گئی
ہوئی صید بندی کی جنگل میں دھوم — گرے فیل جیسے گھٹا آوے جھوم
بیاباں میں چھایا ہے کیا ابرِ مرگ — برستی ہے گولی بسانِ تگرگ
نہ دل سرد ہے ببر و گرم شتاب — دلِ شیرِ برفی[۵۲] بھی ڈر سے ہے آب
ہوئی گرم آتش زنی سے ہوا — رکھا آب میں جا کے لگ لگنے پا
محیط آبگیروں[۵۳] کے تھے مرد کار — ہوئے مالکِ[۵۴] الحزن چندیں ہزار

۵۱ کچھوے ۵۲ برف کے شیر جو بچے کھیل کے طور پر بناتے ہیں ۵۳ تالاب ۵۴ داروغۂ دوزخ۔

بہت دام پانی کی جانب کھچے
کھڑے رہ گئے رود کیا کیا رکے

ٹھٹھک سو من گھڑیال رہ رہ گئے
مگر کچھ نہ جانے کدھر بہہ گئے

نہ قشقل نہ شلّی[۱] نہ سرخاب ہے
تمام اُن کے لوہو سے سرخ آب ہے

عجب روغن قاز ملتے تھے یار
کہ قازوں کو لیتے ہوا میں سے مار

منگاتے تھے بطخ کی چربی ظریف
سو وہ چربی اب پھینکدیں ہیں حریف

ہوئے کتنے اقسام ماہی شکار
نہ آوے قسم کھائے بن اعتبار

مگر مرگ ماہی تھے جالوں کے بیچ
کہ یوں مچھلیاں سب نکالیں اُلیچ

نہ ارنب[۲] ہے جنگل میں نے سوسمار
کوئی بدّوی[۳] کیا کھاوے پروردگار

کلنگوں کی اُلٹی گئی صف کی صف
ہوئی بیچ میں قرقری بھی تلف

نہ جیسے گئے سبزہ کھا کھا کے جیت
بڑے دیسے ہیں آئے کھیتوں میں کھیت

بٹیر اور تیتر کا ہے کیا شمار
کہ باز آ گئے جرّے کرتے شکار

ہوا زرد سبزک بہت دل میں ڈر
نمد مو ہوا گرد سے شانہ[۴] نہ سر

خطرناک تھا وشت کیا کہیے مور
دبا یوں پھرے جیسے دبتا ہے چور

نہ پاڑھا نہ نیلا نہ چیتل کوئی
بنوں میں جو تھے دن تھے گیا چل کوئی

کوئی میر صاحب غزل یاں کہو
پر ایسی کہ ویسی کسی سے نہ ہو

نشیب و فراز بیاباں کو سن
جو ذی ہوش ہیں وے تو ہوتے ہیں سُن

چڑھو آسماں پر جو ہووے چڑھاؤ
پھر اترو تو تحت الثریٰ ہی کو جاؤ

جو اس میں کہیں ہووے لغزش تو خیر
کہ در پیش ہے اور عالم کی سیر

زمیں ضیق از بس ہوئی یک بیک
نہ پھیلا سکا پاؤں گرنبا[۵] تنک

ملے پر سے پر تھے ہوا پر کلنگ
کہ چلنے لگے یاں سے تیر و تفنگ

نہ پر تھا نہ پر زا نہ بازو نہ پا
کنھوں نے بھی پوچھا نہ یوں تھا یہ کیا

۱؎ مرغابی ۲؎ خرگوش ۳؎ جنگل میں رہنے والا ۴؎ ہُد ہُد ایسے تھے جیسے کوئی جل گیا ہو ۵؎ سارس

نہ زردی کو دیکھا نہ پایا کبود — نکالا ہی لوگوں نے پانی بہے وود
تو آگے بیابانِ پُر خار ہے — کہیں جھاڑ بوٹا کہیں خار ہے
بیابان وحشت اثر پُرخطر — یہی ڈر ہے ڈر کیا ادھر کیا اُدھر
جہاں تک نظر جائے سوکھی ہے کانس — اگر سبزہ تھا بھی تو تھوہڑ کا بانس
کہیں دل رُکے بند ہو جائے دم — لکھوں کیا نیستاں ہی تھی بابِ قلم
چلے باد دن کو تو ہو سائیں سائیں — پڑے رات تو پھر کرے بھائیں بھائیں
نہ سبزہ نہ کھیتی نہ آبِ رواں — کوئی شیر غرّاں کہ پیل دماں
سو وہ شیر مارا گیا مثلِ سگ — وہ ہاتھی پکڑ لائے بے تاز و تگ
کوئی دشت ایسا کہ تھا سبزہ زار — ہوا دلکش و جرگہ جرگہ شکار
اگر آہو گیری کا ہوتا نہ عیب — تو وہ ہم بھی رکھ لیتے بیشک و ریب
بسطحِ زمیں میل در میل تھی — نہ دریا چہ تھا کوئی نہ جھیل تھی
ہوا اک جبل سامنے سے سیاہ — اسی کی طرف کو پڑی سب کی راہ
عجب لطف کا تھا وہ کوہِ گراں — کہ صد چشمہ کا اس میں پانی رواں
شجر سبز و پتھر بہت صاف تھے — سبھی جیسے الماس شفاف تھے
ہوا ایک ابر اُس جبل سے بلند — ہوا پر بچھے اُس کی تہ تُوی پرند
پہر دن سے بارش لگی ہونے زور — رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
ہوئے خیمے پانی کے اوپر حباب — سب اسباب لوگوں کا تھا زیرِ آب
نہ پوچھ اور اسبابِ مردم کا حال — نہ چادر رہی خشک نہ کوئی بال
قنات اور تنبو پسر سب گئے — کھڑے تھے جو کنرے لگے تب گئے
بھرا پانی لشکر میں پھیلا ہوا — اگر فرش بستر تھا تھیلا ہوا
ہوا سرد از بس ہوئی ایک بار — کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی سی پار

۱؎ چھانے والے۔

پھرے باد سے لوگ منھ ڈھانپے | جگر چھاتیوں میں ہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار | ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار
بہت پیر جب جی کو تجنے لگے | جوانوں کے بھی دانت بجنے لگے
تہہ میغ خورشید پنہاں ہوا | نہ دیکھا مگر روئے جاناں ہوا
ہوا پر جو تھے مُرغ پرواز میں | گرے سیکڑوں ایک آواز میں
بہت جانور کھا گئے کر کباب | ہوئے آشیانے ہزاروں خراب
برس مینہ وو دن میں کھل بھی گیا | ولیکن ہو کہرا۔ لطیفہ نیا
کہ اندھیر تھا جیسے ظاہر ہو دود | ہوئے ہونٹھ سردی سے سب کے کبود
بلا دھوم سے کوئی گھبرا اٹھے | جنھیں دیکھو وے کانپتے ہیں کھڑے
یہی چال تھی ایک دو چار کوس | ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی پڑی ایسی اُوس
بلُندی تھی اُس کوہ کی تا فلک | نگہ جاتے ہی جاتے جاتی تھی تھک
نہ اس رنگ سے صید ہوں گے کہیں | ہوئی خون کے رنگ رنگیں زمیں
ہوا ایک جنگل میں آکر گزر | کسو کو نہ تھی واں کسو کی خبر
تراکم[۵] قیامت تھا اشجار کا | ستم پھر ہوا ہی ستمگار کا
کہ اس مرتبے بارد و سرد تھے | ہوئے سُن مگر برف پرورد تھے
کوئی خار بن حائل رہ ہوا | پھٹے پیرہن ہوش سب تہ ہوا
درختان بے برگ و بر بدنما | نہ اک شاخ پر مُرغِ رنگیں نوا
بہت سر ملائے بہم تھے شجر | ولیکن نہ پایا کنھوں نے ثمر
نہ قمری ہوئی نالہ پرداز ٹک | نہ بلبل کی واں آئی آواز ٹک
یہی کل مکل تھی یہی کشمکش | پھرے مارتے سر کو دیوانہ وش
نکلنا ہوا کھینچ کر یہ عذاب | ملا بیشتر ایک تہہ دار آب

۵ گنجانی۔ گھنا ہونا۔

رواں تھا کسو کی طرف تند و تیز
ہوا اس کے چلنے کی تھی پیش خیز

حباب اس کا چشمک زناں موج پر
کہ یوں گرم جاتے ہیں اہلِ نظر

پہاڑی کہ تودا کہوں خاک کا
کہ انبار تھا خار و خاشاک کا

محاذی تھا اس کوہ کے ایک دشت
کہ دشوار تھا اس میں آدم کا گشت

ہوا ابر بہت اور پانی سے لگے
قدم راہ چلتے ہوئے ڈگمگے

چلے باؤ تو اک موحش ہو شور
رکھے پاؤں دامن کو کھینچے بزور

فقط خارِ بن کیا کپڑ پھاڑ تھا
کہ بوٹا بھی واں جھاڑ جھنکاڑ تھا

چلو ہے چلو ہے پہ چلتے نہیں
کہ اشجار آگے سے ٹلتے نہیں

نہ ڈٹیں نہ سرکیں نہ کاٹے کٹیں
مگر پچھلے پاؤں ہی راہرو ہٹیں

کہیں ہاتھی آیا ہی بھڑکا ہی اونٹ
کھڑے لوگ پیتے ہیں لوہو کے گھونٹ

کہیں ہیں گے انفار سرگرم جنگ
کرے ٹٹو پر تل کا عرصہ ہیں تنگ

قیامت نمودار ہر ہر قدم
سے چلے کوئی کیا رکھ کے سر پر قدم

کہیں بچ کے نکلے کہیں جھاب چلے
کہیں مضطرب سے کہیں رک چلے

کہیں بید کے برگِ خنجر گزار
کہیں پا نہ رکھنے دیں سرتیز خار

اگر بید آئے تو بن بید باف
نہ آئے نظر دور تک راہ صاف

اگر بانس تھے واں تو تھے دشت دشت
کہ دشوار تھا دو قدم کا بھی گشت

رہا ہر قدم گرنے ہی کا خطر
چلے دو قدم راہ پائی اگر

بہت لوگ دشتِ قلم کو گئے
بہت اسپ و اشتر عدم کو گئے

شجر سرکشیدہ بہت۔ کیا کہوں
جو دیکھوں تو پگڑی سنبھالے رہوں

نہ سبزہ کہیں تھا نہ آبِ رواں
نہ دامن میں اس کے چکارا دواں

دکھائی نہ دیتا تھا خوش قد نہال
سیاہی پکڑتے تھے چشمِ غزال

نہ پھولی تھی سرسوں نہ کچھ تھی بہار
نہ ظاہر ہیں اس کے کہیں لالہ زار

نہ چشمک زناں دور و نزدیک گل
نہ نرمی سے آتی تھی بادِ قبول

چلے باد ایسے کہ جھکڑ بہ سے
ہوا اور پانی میں پھکڑ رہے

اُدھر باد کا شور ادھر آب کا
شب و روز مذکور کیا خواب کا

ادھر کے تئیں ایک تھا آبشار
وہ البتہ شایانِ سیر و شکار

وہیں ایک دم تھا دلوں کا لگاؤ
اُڑانے نہ دے جو حواسوں کو باؤ

سوا پنے تئیں تو نہ تھا کچھ دماغ
کہ حال اپنا تھا جیسا بجھتا چراغ

بہت شعبۂ کوہ مشہور تھا
زبانوں پہ لوگوں کی مذکور تھا

رواں دو طرف اس کے ایک آب کم
کہ دل کو لیے جائے بے تابِ غم

جہاں تک نظر کیجیے مد نظر
ہوا موج زن کوہ سے تا کمر

نظر والوں کے جی بھی ڈھلنے لگے
گرفتہ دل اس جا پہ کھلنے لگے

وہ پانی چلا واں سے دریا ہوا
رواں گرم تر سوئے صحرا ہوا

بہا دامنِ کوہ میں سنگ پر
کیا سنگ ریزوں کو کج نگاہ

کہ لوگ ان کو ہاتھوں پہ رکھنے لگے
ہوا ہر کے رنگوں پہ تکنے لگے

کراڑوں کا کیا عظم کیجے بیاں
برابر کھڑے تھے وہ کوہِ گراں

انھیں میں سے تھی راہ اس آب کی
وہاں بھیڑ رہتی تھی احباب کی

غرض ہو وہ تدبیر جہاں ارجمند
رہیں کاملاں کار عالم پسند

در اس کا ہو بابِ تجویزِ سراں
رہیں حکم کش اس کے زور آوراں

صدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار
جہاں میں سخن ہو مرا یادگار

۱؎ بلند کنارہ۔

صید نامہ سوم

مکرر ہوئی نواب کو قصدِ صید — بیابانِ پہنا۱ در اب ہوں گے قید۲
رواں بحرِ لشکر ہوا موج موج — گئی چشمِ خورشید تک گردِ فوج
بحار۳ و صحار۴ی پہ ہے عرصہ تنگ — مگر یاں سراسیمہ ہیں واں پلنگ
پہن بیٹھے ہیں شیر شیری۵ لباس — کریں لوگ شاید فقیری کا پاس
چکارے ہرن دونوں اندیشہ مند — داوں میں ہراس کمان و کمند
کہیں گرگِ وادی کو فکرِ گریز — نظر ایدھر اودھر کرے شیر تیز
بنوں میں ہے آشوب کو ہول پڑ — بیابان وطن سارے گرم سفر
اسد کی نہ شیرانہ ہنکار رہی — نہ کفتار۶ کو تابِ رفتار رہی
جہاں کے تہاں فکر میں ہیں کھڑے — کہ دنگل میں جنگل میں کیا بن پڑے
وحوشِ بیاباں کو وحشت غضب — ہوا ہیں کھڑکتے ہی پتے کے سب
ہزاروں ہی بندوق ہر دم چلے — ہوا ہی میں پیچھے پکھیرو سے چلے
شترمرغ سیمرغ ازبس ہراس — نہیں آتے کوہ شمالی کے پاس
اُٹھا فوج میں سے یہ گرد و غبار — کہ منھ پر تھا خورشیدِ آئینہ دار
فلک کہرے سے تھا دھواں سا نمود — سماں شب کا رکھتا تھا ملکِ شہود
زمیں تھی سو تھی فرشِ بالائے آب — تخاغل سے مطلق نہ گھٹتی تھی تاب
نہ پوچھو کہ لوگوں کا کیا حال تھا — جو رکھیئے قدم واں تو بھونچال تھا
کیئے گم جو گینڈے نے اپنے حواس — کھڑا ہو رہا آکے بھینسوں کے پاس
کہ بھینس اس کو بھی جان کر لشکری — چلے جائیں صرصر نمط سرسری
کہیں جی اُٹھی تھی زمیں بعدِ مرگ — نہال اس کے خوش قد و بسیار برگ

۳ بحر کی جمع ۴ صحرا کی جمع

۱ کشادہ در یعنی کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ ۲ ہونگے قید یعنی گھیرے جائیں گے۔ ۵ شیر کی کھال کا لباس جو فقیر پہنتے ہیں ۶ ایک جانور جو گینڈے کو کھا لیتا ہے۔

نہ بستی سے صحرا تلک سبز تھے   نظر جائے جس جا تلک سبز تھے
ہوا دلکش و ہر طرف سبزہ زار   کہ سرسوں نے کی تھی قیامت بہار
کسو ایسے جنگل میں جانا ہوا   کہ مشکل قدم کا اٹھانا ہوا
چلی ہر طرف اب جو اکر تفنگ   نہ اوقات صلح و نہ ہنگام جنگ
لگی آگ جنگل میں چارا گیا   بن آئی نہ کچھ مفت مارا گیا
ہوا[1] چہرہ کوئی تو جوں شیر سنگ   نہ شیری دلیری نہ چہرے پہ رنگ
تحمل ہو کچھ بھی تو تدبیر ہی   کریں کیا اگر یوں ہی تقدیر ہی
کہیں دون گئی ہر تمامی ہی دود   کہیں دو شجر ہیں سو کیا بد نمود
نہ پتا نہ شاخیں نہ کچھ ان کو بار   سراپا ہی خشک و زبون و نزار
نہ سایے سے ان کے کوئی بہرہ مند   نہ دیکھا چرندہ نہ آیا پرند
کشیدہ قد اس بن کے سارے درخت   چمن کے تھے نوبادگان سر بخت
برابر برابر کھڑے سر بسر   پھرے دیر اودھر کو جا کر نظر
پرے چل کے آیا ترا کم[2] بہت   جو اس اس میں جا کر ہوئے گم بہت
کہیں راہ نکلی تو چلتے پڑے   رہے پال و پر تل بہت واں کھڑے
کہ شاخوں نے جھاک جھاک ملائے تھے سر   بہت آگے جا جا کے آئے تھے پھر
وہی راہ در پیش و کثرت ہوئی   قیامت کے اوپر قیامت ہوئی
عجب راہ پُر خوف مشکل گزار   نہ ہوتے تھے معلوم ہاتھی سوار
خطر شیر کا شور بنگاہ[3] کا   عجب واں کے جانے کا غم راہ کا
کہ جاؤ زمیں کچھ ہویدا نہ تھی   کہیں اس میں یک ڈنڈی پیدا تھی
گڑھے خار پاؤں کی لغزش بلا   چلی باؤ تونے کی لرزش بلا
صدا برگ نے کی نہایت مہیب   طرق[4] عجیب و مسافر غریب

[1] مقابل ہوا۔ [2] کھنچاتی۔ گھنا ہونا۔ [3] مراد ٹاٹر یا مچان سے [4] نل۔ نرکل۔ [5] راہ۔ راستہ

جنوں پیشہ وہ دشتِ وحشت شعار — کہ قبل اُس کے طفلانِ بازی مدار

کہیں پانی آیا سو حالت خراب — کہ تھا زبرکاہ اس میں ہر جائے آب

چلے صبح کو دامنِ کوہ کو — تماشا کناں فوج و انبوہ کو

درختوں میں چلنا تو دشوار تھا — ولے رستہ بھی قدم دار تھا

گزارا ہوا یوں نہیں اک آدھ کوس — پٹیلے پہ ہنگامہ آرا تھی اوس

نیستاں میں چھپتا تھا گھوڑے سوار — اگر ہو تو واں شیر کا ہو شکار

نہ رہتے تھے سو شیر شرزہ بھی واں — نہ ہاتھی کے پاؤں کا پایا نشاں

عجب کشمکش درمیاں آگئی — بھٹ اک بلا تھی جہاں آگئی

نہ ہلنے کو جاگہ نہ چلنے کو راہ — سروں پر کھڑے ہیبتِ فیلِ سیاہ

بہا سنگ ریزوں پہ اس رنگ آب — کہ قدر ان کی جوں قدر یاقوتِ ناب

لیئے عمدے ہاتھوں میں دو مکھیں بہار — کہ ہر شیٔ کا ہے وقت لیل و نہار

اسی آب کا راتی یاں ہے نام — ہمیں ساتھ اس کے ہے ربطِ تمام

کنارے کنارے اسی کے ہے راہ — چلے جاتے ہیں گو نہ ہووے پناہ

جبل سے ہوئے ظاہر آثارِ آب — برسنے لگا قطرہ قطرہ سحاب

شکار افگناں راہ کرتے تھے طے — ملے جاتے تھے خاک میں دشتِ نَے

بڑے جانور خوار کیا کیا ہوئے — بندھے پائے فیلاں سے رسوا ہوئے

بہت نالے کھولے پکھالے گئے — بحیروں سے رہ ہو نکالے گئے

مگر کی پس از مرگ عزت ہوئی — کہ ہاتھی پہ چڑھنے کی خصمت ہوئی

کشف کا ہوا ہے یہ اوصاف اب — کہ جھینگوں نے کی سرخ کشاف آب

وگرنہ بشر کا نہ مقدور تھا — قریب اس کے جانا بہت دور تھا

بحیرہ نہ دریائے اعظم سے کم — اُٹھا کرتے تھے لجے لطمی بہم

۱؎ پہاڑ سے ۲؎ دلدلی زمین ۳؎ گزر ۴؎ بانس نرکل وغیرہ کے جنگل ۵؎ کچھوا ۶؎ طمانچہ مارنے والے

ہر اک موج اس کی سمندر کی لہر
کنارے پہ گرداب غرقابِ قہر

یہی جنگل اس جھیل کے آس پاس
درختوں کا انبوہ نِی کا اکاس

اسی بن میں شیر اور ریوزہ پلنگ
اسی بن میں گور و گوزن[51] اور رنگ[52]

اُسی بن میں ہاتھی وہیں کرگدن
وہیں فوج سرزن اسی میں ہرن

اسی بن میں لنگور بندر بھی تھے
وہیں ایک دو ہم قلندر بھی تھے

اسی بن میں پاڑھا وہیں نیل گاؤ
اسی بن میں یہ صید بندی کا چاؤ

اسی بن میں تھے حضرت بوحمید[53]
اسی بن میں نسناس[54] ان کے مرید

اسی بن میں تھے خوک جاموش تنگ
کیا اس سویربن نے لوگوں کو تنگ

اسی بن میں رہنا اسی بن میں راہ
وہیں شام کا حسن و لطفِ پگاہ

اسی بن میں وہ جھیل گہری بہت
ہوئے صید بری و بحری بہت

وہیں مچھلی بکتی تھی دمڑی کی سیر
ولیکن نہ کھاتا تھا ہو کوئی سیر

کہ اس آب کا ہضم دشوار تھا
کہ جوں آبِ شمشیر دم دار تھا

شغال اور خرگوش جیسے گئے
شکاری سگ ان کو چاٹ لے گئے

کنارے پہ تھی اس کی یک گل زمیں
سراسر ہری جوں زمرد نگیں

جہاں تک نظر جائے شاداب تھی
کہ یک دست واقع لبِ آب تھی

نواڑوں[55] کی سیر اس میں ہر شام گہ
وہی سیرگاہ و وہی دام گہ

عجب ڈھب سے کی روشنی صد عجب
کہ دیں چھوڑ نادیں وہیں بھر کے سب

جدا ہو ویں تو غنچہ غنچہ چراغ
ملے جیسے عاشق کی چھاتی کے داغ

ورے روشنی شعلہ انگیز نار
پرے سطح پانی کی آئینہ وار

ہوئیں کشتیاں کچھ ورے سے پرے
چراغوں سے موجوں کے کوچے بھرے

حبابوں میں تھی جو چراغوں کی تاب
حبابی تھا آئینہ سب سطحِ آب

[51] پہاڑی بکرا یا جنگلی بیل [53] (کسی مخصوص نام کی وجہ سے خاص اصطلاح) [54] ایک جانور نصف [illegible] نسان [illegible] [55] [illegible] جو صرف دریا میں سیر کرنے کے کام آتی ہو

نمودار چرخ پر انجم نہ تھی شب
دلوں سے وہ پھیلاؤ پانی کا سب

غرض روشنی کی عجب کچھ تھی لاگ
لگا دے ہے گویا کہ پانی میں آگ

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ
امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ

کسو سے ہوئی شاہ نامے کی ذکر
کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر

گیا شاہجہاں نامہ کہہ کر کلیم
دلِ شاعراں رشک سے ہے دو نیم

لکھوں میں بھی اک عشق کی داستاں
ہنسا کوئی کہانے سے ہمداستاں

پسند آوے آصف الدولہ [illegible]
کہ جمشید نامے بہت بے نظیر

مگر نام تا ہے یہ مشہور ہو
[illegible] بھی لوگوں میں مذکور ہو

زہے آصف الدولہ دادگر
سخنور نواز اور عاشق ہنر

دہش سے جہاں اس کی دولت پذیر
وزیر ابن دستور ابن وزیر

کریمی کرے تو جہاں در جہاں
کفِ جود خورشید سا زر فشاں

سراپائے احساں تمامی ہمم
ہمہ تن مروت سراسر کرم

ہمیشہ رہے گرم سیر و شکار
یہ حرف و حکایت بھی ہے یادگار

اژدر نامہ

(۱۹)

جس میں میر صاحب نے اپنے آپ کو اژدہا اور اپنے حریفوں کو کیڑے مکوڑے ظاہر کیا ہے

یہ موذی گئی نا خبردار فن　　نئی ناگنیں جن کے ٹیکوں پہ پھن
نہیں[۱] جانتیں ہوں میں مار سیاہ　　زبانہ[۲] ہے آتش کا میری نگاہ
نفس ہے میرا افعیِ پیچدار　　گیا جس سے خصم قوی من کو مار
جدھر بھر نظر دیکھوں لگ جائے آگ　　دمِ دم کشی لب پہ پھیلیں ہیں ناگ
جہاں میں ہوں وہ جا ہے پرشر و شور　　عصا سے چلے راہ واں مار و مور
مری آنکھ سے زہر ٹپکا کیا　　جلا آگے میرے کبھو کب دیا
حکایت بعینہ یہ دل سے ہے میر　　سرِ راہ کہتا تھا جو اک فقیر
کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم　　درندوں کے بھی اس سے دل تھے دو نیم
نکلتے نہ تھے اس طرف ہو کے شیر　　پلنگ و تمر[۳] واں نہ ہٹتے تھے دیر
جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب　　شغال اور روبہ کا واں کیا حساب
وہ صحرا تھا اس کے سبب ہولناک　　دم اس کے نے واں کی اڑا دی تھی خاک
نکلتا تھا جب بہر برگ و نوا　　شجر کے شجر ہوتے تھے تب ہوا
کہاں سایہ اس جا وہ سبزہ کہاں　　درخت اس کے چاٹے رہے تھے واں
صدا جب مہیب اس کی ہوتی بلند　　جگر چاک کرتے ہوا سے پرند
درندوں کے بر جا نہ رہتے حواس　　چرندے ٹکانوں سے ہوتے اداس
وحوش اس بیاباں میں پاتے نہ تھے　　طیور آشیانوں میں آتے نہ تھے
کبھو اس کی رہ میں جو اٹھتا غبار　　تو وہ دشت تھا ایک تاریک غار

۱؎ یہ ناگنیں جو میری حریف ہیں یہ نہیں جانتیں　۲؎ شعلہ۔　۳؎ ایک قسم کا چیتا

پہونچتا تھا گردوں تلک شور و شر — ہوا صاف ہوتی نہ دو دو پہر
رہا کرتی کوسوں تلک اُس کی دھوم — نہ اُس راہ آتا کوئی جز سموم
پراگندگی تھی اس انبوہ میں — کہ گونجی بلائے سیہ کوہ میں
اس آواز سے جی نکل ہی گئے — جو ثابت قدم تھے بچل ہی گئے
سیہ جب ہوا ہو گئے منھ سفید — ہوئے مدعی جان سے نا اُمید
مری ان گزندوں کی صحبت ہے یہ — طرف ہوں مری ان کی طاقت ہے یہ
جو مجھ کو ہو کچھ بھی انھوں کا خیال — تو یہ مارگیری کریں کیا مجال
تو کیا ہوا انھوں سے بہت دور ہیں — ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور ہیں
مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے — جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے
کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر — گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

تنبیہ الجہال

(۲۰)

صحبتیں جب تھیں تو یہ فنِ شریف
کسب کرتے جن کی طبعیں تھیں لطیف

تھے ممیز درمیاں انصاف تھا
خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا

دخل اِس فن میں نہ تھا اجلاف کو
کچھ بتاتے تھے یہ سو اشراف کو

تھے جو اس ایام میں اُستادِ فن
ناکسوں سے دے نکرتے تھے سخن

پھر حصول اس سے نہ دنیا ہے نہ دیں
کوئی حاجت اس سے وابستہ نہیں

گر چمار اس کارخانے میں نہ ہو
ٹوٹے جوتے کو کہاں لیکر پھرو

چار نا چار اُس کنے جانا پڑے
کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے

حاجت اس فقرے سے مطلق یاں نہیں
جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں

یہ تو دُنیا میں ہے اس فن کو کمال
دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال

کذب ہو جس جائے رونق بخشِ شمع
واں کی دینداری رکھے اور دل کو جمع؟

جھوٹ آوے اس قدر جب درمیاں
کیا یقیں۔ ایمان کیسا۔ دیں کہاں

ہم تلک تھی بھی وہی رسمِ قدیم
یعنی جن کے ہوتے تھے ذہنِ سلیم

پیار کرتے تھے انھیں اُستادِ فن
ان کے ہوتے رہبرِ راہِ سخن

جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار
شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا

الغرض یاروں نے قیدیں دیں اُٹھا
جو کوئی آیا اسے دی پاس جا

تک نہ استعداد سے کی گفتگو
کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو

چار سکھیاں کہہ کے دیں ناکس کے ہاتھ
پھر اسے مجلس میں لائے اپنے ساتھ

... کہہ مکرنی۔ پہیلی۔ (مراد ادنےٰ درجہ کی شاعری ہے)

آپ بیٹھے صدر میں وہ دستِ چپ کرنے لاگے شاعری سے حرف و گپ

بولے ان کو آج کل سے ہے خیال ذہن اُن کا تیزی رکھتا ہے کمال

ہو رہیں گے کچھ اگر صحبت رہی اور ہم سے بھی انھیں الفت رہی

جب ہوا ثابت وہ اُن کا مستفید سب نے جانا اس کو شاگردِ رشید

کی اشارت تا کہ وہ کھولے دہن آگے اُستادوں کے ہو گرمِ سخن

ان کے ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا صاحبانِ فن کے منھ چڑھنے لگا

نیم قد اُٹھ اٹھ کے بھی سُننے لگے جاؤ بے جا سر کے تئیں دُھنے لگے

وہ سراپا جہل ناگہ وقتِ کار ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار

سر میں رکھ کر دعویِ طبعِ لطیف میر و مرزا کا ہوا آخر حریف

کیسی کیسی یوں گئیں طبعیں بباد آفریں شاگرد و رحمت اوستاد

جب تلک یاں تھی تمیزِ زشت و نیک کاہے کو یوں شعر کہتا تھا ہر ایک

اہلِ فن کی رہتی تھی سب کو تلاش ان کے ہاں کرتے تھے جا کر بود و باش

جو کہ خودسر رکھتے اُستادوں سے عار ان کے تئیں ہرگز نہ ہوتا اعتبار

زندگی بلکہ انھوں پر شاق تھی ہاتھ گر لگ جاتی تھی شلاق[ل] تھی

حکایت

شائقِ فن تھا وزیرِ اصفہاں ایک دن آیا ہلالی اُس کے یاں

حاجبانِ در سے ہوا آگاہ کار کی اشارت تا اسے دیں گھر میں بار

عزت و تعظیم کی حد سے زیاد پاس لے مسند پہ بیٹھا شاد شاد

اُن نے کھینچی اس کی مرزائی بہت بیٹھے بیٹھے رات جب آئی بہت

شعر کی تقریب لا کر درمیاں کرنے لاگا شاعری کا امتحاں

شعر خوانی کی پڑھا سو تھا غلط سُنتے ہی بھڑکا وہ شعلے کی نمط

ل ہچی یابید

[illegible]

غصے ہو بولا کہ ہاں فراش چوب — کھینچ لا میداں میں کی شلاق خوب
اس قدر مارا کہ بے دم ہو گیا — سوج دست و پا ہر اک تھم ہو گیا
کھینچ کر ڈلوا دیا دربار میں — یہ خبر پہونچی جو ہر بازار میں
وارث اس کے لے گئے آرات کو — جب پشود آیا تو پایا بات کو
یعنی دستورِ زماں دشمن نہ تھا — یا وہ کچھ نا آشنائے فن نہ تھا
غالباً پایا غلط اشعار کو — خوش نہ آیا اس کرم کردار کو
ورنہ شیوہ اس کا ہے لطف و کرم — جائزے دیں دے ہے دینار و درم
مجھ کو کیوں شلاق کرتا اتنی شب — کاہے کو بدنام ہوتا بے سبب
پس مجھے ہے تربیت اپنی ضرور — جا کے بیٹھوں اک سرآمد کے حضور
صحبت اکثر رکھوں استاد سے — شاید اس کی دولت ارشاد سے
پہنچے اک سنے کو میری قیل و قال — ہو مجھے اس فن میں یک گونہ کمال
اُٹھ کے آیا مولوی جامی کنے — عشق کی یک چند اس نامی کنے
جب ہوا کچھ شعر کا رتبہ بلند — اور مولانا لگے کرنے پسند
پھر گیا اک دن درِ دستور پر — حاجبِ درگاہ نے کی جا خبر
کاے امیر اس روز کا شلاق خوار — آج در او پر ہے پھر خواہانِ بار
کی اشارت سدِّ رہ کوئی نہ ہو — قصد ہے برخورد کا تو آنے دو
سامنے آیا تو کی نیچی نظر — دھوپ میں جلتا رہا وہ اک پہر
بعد ازاں ایمائے ابرو کی کہ ہاں — صحن ہی میں سے ہوا وہ مدح خواں
پھر وہیں سے دے صلا رخصت کیا — اک مصاحب نے جگر کر کر کہا
اگلی صحبت کی تھی عزت اس قدر — سو ہوئی شلاق حد سے بیشتر
ابکی اس کو جائزہ دے کر گراں — تو نے فرمایا مرخص واں سے واں

زبردستی میدان میں لا کر خوب بید مارے ۔ حواس ٹھیک ہوئے ۔ فائدہ ۔ ہمت کر کے ۔ ترکی زبان میں بید مارنے کو

میں نہ سمجھا یہ کہ وہ کیا تھا یہ کیا
در جواب اس برگزیدہ نے کہا

ایسی ہی ہوتی ہیں تضحیک سلف
وسعت[1] ہو تو ان کے تئیں کیجئے تلف

اس قدر اس کا تنبیہ تھا ضرور
تاکہ پہونچے یہ خبر نزدیک دور

جو سنے سو خودسری سے باز آئے
تربیت ہونے کو استادوں کی جائے

ورنہ کرتا پوچ گوئی ہر دبنگ
رفتہ رفتہ شاعری ہوجاتی ننگ

تب جو میں شلاق کی۔ یہ خام تھا
اب جو آیا لایقِ انعام تھا

قصہ کوتہ تھی تمیز درمیاں
ننگ ہی کرمِ[2] مزابل پر بھی یاں

بے تمیزی سے ہی رائج ابتری
جس کو دیکھو خودنمائی خودسری

نے بیاں کا ہی سلیقہ نے زباں
اس پہ ہی ہر ایک سحبانِ بیاں

بس قلم وقتِ زباں بازی نہیں
چپ کہ دورانِ سخن سازی نہیں

کون حرفِ خوب کو کرتا ہی گوش
بات کی فہمید کا ہی کس کو ہوش

بے تمیزوں سے بھرا ہی سب جہاں
ہی دماغِ حرف ہم کو بھی کہاں

۱ قابو۔ اختیار

۲ غلاظت کے کیڑے

ہجو نااہل

(۲۱)

سُنیو اے اہلِ سخن بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجھکو اک تخمِ حرام

پرہنہیں[1] مرغی کا گرم طیر ہے
وہم ہیں شہباز کا ہم سیر ہے

کام مجھ کو کچھ نہیں ہے اوسے
بلکہ اس بھی طرز سے اُس طور سے

شاعری کو میری ہو گے جانتے
تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار
کن دنوں تھا ہجو کا کرتا شعار

گر کنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا
ہجو اُس کی ہوگئی اس کا کہا

کیا ہوا گر چاند پر پھینکیں ہیں خاک
پڑتی ہے ان سب کے منھ پر میں ہوں پاک

رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ
مدعی بے ہیچ[2] ہے یہ روسیاہ

تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا
درد مند و عاشق و دلریش تھا

پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب
غصّے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تب

ایسے کتنے ہیں جواب شاعر بنے
مدتوں یہ لونڈے آ رہے مجھ کنے

ایک باتوں سے مری آدم ہوا
ایک نظر سے شہرۂ عالم ہوا

ایک نے دیواں کی میرے نقل لی
اس دوالے کی کنھوں نے عقل لی

ایک میرے طرز پر کہنے لگا
دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم میں ہیں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دور سے کرتا ہوں بیٹھا سب کی دید
کوئی سر کھینچو ہے میرا مستفید

کوئی[3] ہے نہ کو نجانے میری قدر
پائیں ہے پائین آخر صدر صدر

ہے گی شخصیت خدا کی اور سے
ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے

ایک کُنجڑا دے جو اک عمدہ کو بھوگ
تو اسے کیا کچھ طرف جانینگے لوگ

جو بڑے ہیں وے ہی آخر ہیں بڑے
ایسے کُتّے بہت پھرتے ہیں پڑے

شہر میں آیا میں بعد از بست سال
گم تھا یاں سر رشتۂ قال و مقال

کسب جو کرتے تھے یہ فن شریف
ان میں سے کوئی نہ تھا میرا حریف

کتنے اک نو مشق تھے گرم سخن
سو بچارے آپ ہی ناآگاہ فن

مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر
مردۂ صد سال سے بے نور تر

کاسہ لیس مایۂ خبث و حسود
قلبۂ دہ روزہ سے بھی بد نمود

آتے اچھا ہے جو اس کو روک دو
ورنہ منھ دیکھو تو وو ہیں اوک دو

ایک جا آیا شتر گھر گیا
واں شتر غمزہ سا مجھ سے کر گیا

رہ گیا میں پی کے لو ہو کا سا گھونٹ
یعنی دیکھوں بیٹھے ہے کس کل یہ اونٹ

اس تحمل پر نہ کی مطلق نظر
خار پہلو کا ہوا ہر جا یہ بچر

جب لگا ہے ناچنے مستی سے خوب
تب لیا میں نے قلم کے زیر چوب

مستی اس کی ساری اب جھڑ جائے گی
دھوم ساری گلیوں میں پڑ جائے گی

جب بڑوں سے مار ناہموار کھائیں
کج خرامی سے تب اپنی باز آئیں

راہ سیدھا ہو کے چلتا ہے بلے
اونٹ جب آیا پہاڑوں کے تلے

اونٹ کی خلقت پہ ہے قدرت کو ناز
اس کی خلقت کم ہے کیا اے بے نیاز

اس کو یاروں نے غرض کیا کیا کہا
لیک یہ خر نامشخص ہی رہا

بے سبب سرگرم کیں ہم سے ہوا
مستحق لعنت عالم سے ہوا

چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا
پاس کب تک کیجے نام و ننگ کا

یاں زبردستوں کو دعویٰ کھا گیا
یہ چھپا رستم کہاں سے آ گیا

تھا قیامت فہم کو دعوے بڑا
ہو گئے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا

له کرو قسمه کا کر ۔۔ ثلہ ۔ ۵ے قے کردو لکھ جس کا گھر لٹے ہو

ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے — چیونٹی کا کیا جگر جو منھ پہ آئے
جنگ ہاتھی کی ہو گو اس کو ہوس — پر اسے ہے موت کا ریلا ہی بس
ایک دھکے میں کہاں وہ کامنی — پودنی کی سی ہے اس کی ضامنی
میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد — پر کمی کرتا ہے یہ ابنِ زیاد
قبلہ کہتے کہتے حاجی ہو گیا — پاسِ ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا
رشک حسرت سے مری مرنے لگا — میری عزت کا حسد کرنے لگا
لگ گئی چپ اس کو میرے شور سے — یہ نہ سمجھا ہے خدا کی اور سے
یہ قبولِ خاطرِ لطفِ سخن — دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن
ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور — اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور
خصمی وہ کرے کہ ہو معقولِ خلق — نے انھوں سے جو کہ ہوں مقبولِ خلق
دشمنی تھی اس کو مجھ سے کیا ضرور — حیف ایسی عقل۔ لعنت یہ شعور
ہوں جو میں پرتو فگن تو ہے یہ کیا — خور کے آگے ذرہ کب ٹھہرا رہا
خونِ دل آشام ہیں جو صبح شام — وے بھی لیتے ہیں ادب سے میرا نام
یہ مری رہ کا نہ حائل ہو سکے — یہ موئی جوں کیا مقابل ہو سکے
میں نے اُلٹی اجگروں کی دم میں صف — ادھ موئی سی چھپکلی کیا ہو طرف
رکھتی ہے میری شرافت اشتہار — گو یا ناسید کہے ہے کیا؟ چمار
ہجو کی کیا اُن نے میں کیا دب گیا — بھونکنے پر سگ کے ہاتھی کب گیا
ننگ ہے میری توجہ اس طرف — حیف ہے میلانِ دریا سوئے کف
دار و دستی سے ہے اس کی مجھ کو شرم — تب تو باتیں ہیں کروں ہوں نرم نرم
ان عزیزوں کا نہایت پاس ہے — ورنہ یہ ملعون کیا کناس ہے
جو نہ سمجھا تیغ خامی ہی کے پاس — کاٹوں گا یوں جس طرح کٹتی ہے گھاس

جب سے لے آیا قدم اپنا یہ شوم
تب سے ویراں ہو گئی یہ مرز و بوم

ایک بد یمنی ہی ہے گی بوم میں
لطف وہ پائے ہیں ہم اس شوم میں

دیدنی ہی قدرتِ رب و دود
ایسی اچرج کم ہی ہوتی ہی نمود

کیا کمی ہی یہ جو عزت کم کرے
گو نہ شیطاں سجدۂ آدم کرے

کرتی ہی تعظیم میری کائنات
لعنت اس پہ ہوتی ہی دن اور رات

بیت کہنا چاہتا ہی تو ہنر
شاعری سمجھا تھا کیا خالا کا گھر

نامبارک ہی نہیں سادہ بھی ہی
اُلّو ہی اور اُلّو کی مادہ بھی ہی

عقل سے کس طرح ہووے بہرہ ور
ہی کسو حافظ کا نطفہ یا چہ خر

پر وہ حافظ جو ہو قرآں خوانِ قبر
اس سے لیں کارِ تلاوت کو بہ جبر

جھڑ گیا ہووے دماغ اس کا تمام
پڑھتے پڑھتے شور سے ہر صبح و شام

وہ خرف[۱] جورو سے جا یک جا ہوا
ایسا اُلّو نا سزا پیدا ہوا

دیکھ کر ان کی خرامی پائے[۲] سرو
ایک کوّے نے کی تقلیدِ تدرو

کود کر چلنے لگا آخر کو راہ
اپنی بھی رفتار بھولا رو سیاہ

کاش کے ہو ویں محذر شیخ و شاب
چھوٹا سا مُنہ جو چکا[۳] سے کا ہی باب

بد نمائی اس کی ہی بے ساختہ
کیا ہی یاں میشِ بچہ انداختہ

دیکھ اسے یاد آوے قدرت کاملہ
کیا بلا ہی مادہ خوکِ حاملہ

گرگ گردن۔ خوک جثہ[۴] غوک سر
غولِ صحرائی کا بچہ ہی مگر

چار سکھیاں کہہ کے شاعر ہو گیا
اس فنِ مشکل کا ماہر ہو گیا

باپ کو ان نے بنا رکھا ہی اُوت
ہیں کہاں ایسے سعادتمند پوت

کم ہوا ہی گا جو اس کا زورِ پا
جانتا ہی اس کو پیری کا عصا

کچھ نہیں معلوم اس کو سترِ کار
تب تو ٹھہرایا ہی اس کو راز دار

۱؎ جھکا ہوا بوڑھا ۲؎ سرو کے نیچے ۳؎ خارپشت سیہی (جس کے بدن پر کانٹے ہوتے ہیں) ۴؎ ستہ۔ م

تعریف آغا رشید خطاط

(۲۲)

میر خطاط یک قلم دیکھے — لیکن آغا سے لوگ کم دیکھے
یعنی عبدالرشید تھا استاد — خوشنویسی کی جن نے دی ہے داد
خط کی خوبی کا اس کی اب تک ڈھنگ — صفحۂ روزگار پر ہے رنگ
وہ تصرف کہیں جو کرتا ہے — شکل نقاش رنگ بھرتا ہے
حیرت افزا ہے حسن ہر تحریر — مشقی اس کی ہے قطعۂ تصویر
خط شیریں جو اس کا پاتے ہیں — ہم حلاوت بہت اٹھاتے ہیں
لگ گئی ہے قلم تو جادو ہے — مد جہاں ہے کسو کی ابرو ہے
سطر لکھتا نہیں خفی کی دو — خط ہے خوباں کی پشت لب کا وہ
ایسا لکھنا کسو کی طاقت ہے — ہے جلی بھی تو ایک بابت ہے
خط نیش کیسا ہی کوئی کامل ہو — اس کا کب نقطۂ مقابل ہو
حرف کس کس ادا سے لکھتا ہے — کون ایسی صفا سے لکھتا ہے
ہے الف قامت نکو رویاں — لام ہے زلف سلسلہ مویاں
دال کا خم رہے ہے ایسا خوب — جیسے جھکتے ہیں مست ہو محبوب
میم جس لطف سے لبالب ہے — دہن تنگ مہوشاں کب ہے
ہے کشش فاژۂ تن خوباں — دائرہ دور دامن خوباں
دائرہ نوں کا اس نمط کھینچا — کر خط دلبراں پہ خط کھینچا
مدعی کو جو خط دکھا دیں ہم — جیسے حرف غلط اٹھا دیں ہم

---

۱ قامت ۲ حمائل - انگڑائی کے لیے بھی آتا ہے ۳ خاستن کی طرف اشارہ ہے، گو شعر کا مفہوم خیز ہو جاتا۔

مذمّت آئینہ دار

(۲۴)

آج سے مجھ کو نہیں رنج و ملال — جب سے نکلے بال تب سے ہے یہ حال
مونگا فوں کا نہیں ہے نام اب — مدعی شعر ہیں حجام اب
ان سے کیش ایک مو برابر بھی نہیں — جلف اشرافوں کے ہمسر بھی نہیں
پر ہوئے سر چڑھ کے یہ ہوئے دماغ — دود ہو جانے لگے سوئے دماغ
ہو گئی گرم سخن تب تو قلم — ورنہ یوں بیہودہ کب نکلا ہے دم
ایسے مونڈے ہیں نے کتنے بے شعور — ہے حجامت اس بھی فرقے کی ضرور
یاں نہ سید کچھ ہے نہ دانائی ہے شرط — ہو کسو کسوت میں دانائی ہے شرط
سگ کو نجم الدین کی سرداری ہوئی — نوح[۱] کے بیٹے کی وہ خواری ہوئی
میرو مرزا میں حکم ہووے خرد — ڈوم[۲] کی نائے جن پہ سبکا دست رد
سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر — نی وہ رگ[۳] زن جو نہ سمجھے سیر شیر
مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت — یاں تائی[۴] داں اس عجالت ہے بہت
جس جگہ میں نے رکھی منھ میں زباں — ہوتے اس جاگہ جو مرزا بے گماں
استرے کانوں میں اپنے باندھ کر — کب کے اب تک گھس گئے ہوتے ادھر
ان کمینوں کا گلہ کیا کیجیے — ایسے دوں پیدا ہوں گر نہ لیجیے
کہتے ہیں سرگرم بیباکی ہے یہ — ہوں تو ہوں ناپاک کیا باکی ہے یہ
لکھیے اس فرقے کی اب تا چند ذم — خط بنا دیں ایسا کریے کف قلم
گرچہ ان کو کہتے ہیں آئینہ دار — لیک ان کا منھ نہ دیکھیں کاش یار
صاف قینچی پر انھیں چڑھوا دیجیے — گر سند[۵] ہو اس میں پھر ہو جائیے

لہ آئینہ ۲ے نائی سے بانسری۔ مطلب یہ ہے کہ بڑے مرزا لوگ اس کی بانسری نہیں بجاتا ہے جتنا پیٹ چاہے منتق کرے ان کے فیصلے کو عقل کی ضرورت نہ ہے

چاہو ہو اس قوم کی کیا شرح حال — آگے ہی آویں گے جتنے ہونگے بال
ایک سفیدان کو نہیں چھنے کی تاب — ہوتے ہیں دشمن یہ کالے بال تک
کیا کہوں کیسے ہیں اونڈھے یہ پچر — کیجیے اصلاح عاید ہو وے شر
کھرچیں ایسا سر کہ کر دیں پائمال — سیدھیاں جب سن لیں تب لیں الٹے بال
معتبران کے جو حجامی ہیں اب — ہند میں وہ تیرہ روشامی ہیں اب
کوئی لے جائے جو حاجت غسل کی — چلّو چلّو پانی پر دیتے ہیں جی
لعنتیں کرتے ہی گذرے اس کو واں — غسل میں فرصت تشہد کی کہاں
بیٹھے حمّام خانے میں کیا غسل کر — جیب شاگردوں نے واں رکھی کتر
لیک پھر اجرت کے اوپر جنگ ہے — لات ہے گالی ہے پھر سر[۵۳] چنگ ہے
اُس سقاوہ میں گیا تھا اک حریف — اس کی فی الجملہ طبیعت تھی ظریف
دھوکے پاجامہ نہانے بھی گیا — ایک طرف پھر پائخانے بھی گیا
غسل کے پیچھے جو منھ گھر کو کیا — ہاتھ نائی کے سوا پیسا دیا
نائی نے پوچھا کہ پیسا یا ٹکا — دمڑی یہ کیسی ہے میں قرباں گیا
ہنس کے بولا تو نہ بد[۵۴] لے جائیو — یاں ہگا بھی ہے اسے اُٹھوائیو
چوہرے نائی ہیں سارے ایک ذات — ان میں ہے بد ذات جو ہو نیک ذات
کاٹیے ان کے تئیں مثل گزر — ہنڈے کے ملکے ہیں اکثر پاچہ[۵۵] خر
بعضے بعضے ان میں سے جرّاح ہیں — بحرِ خون و ریم کے ملّاح ہیں
زر و زنگاری کئی ڈبے ہیں ساتھ — حیض کے سے ایک ڈولتے ہیں ساتھ
موم ڈالیں تیل میں مرہم کریں — پھر مسیحائی کا دم اس پر بھریں
پھیر بگڑے بیٹھیں ایسی شان سے — آئے ہیں گویا ابھی ایران سے
باپ سے اپنے اگر پیسے نہ پائیں — داغ کو اس کے جراحت کر دکھائیں

بعضے بعضے ان میں رعنا ہیں اگر — سو مشعلچی ہیں بھگت کے بیشتر
رنڈی گت ناچے یہ اُس کا منہ دکھائیں — پا بپا مشعل لیئے مجلس میں جائیں
روشنی لے دوڑتے ہیں وقتِ شام — گھورتے ہیں کر کے اندھیارا مدام
تیل کی کُپّی لیئے خوش ہیں کھڑے — ایک بھڑوے ہوتے ہیں چکنے گھڑے
لگ چلیں تو ہیں گے جیسے موچنے — کھائیں جب سر میں لگیں تب سوچنے
چھیڑ لو تو مغز بھی لے جائیں یہ — سر کے تئیں سہلا کے بھیجا کھائیں یہ
بے حقیقت ہیں نہیں شایانِ کار — صحبت ان سے بگڑی ہی پایانِ کار

ایک کتے پالنے والے کی ہجو

(۲۴)

جو اک پھر کو رزق کی وسعت سی ہو گئی
تنگی کی حوصلے نے تو رجعت سی ہو گئی

کتوں کے ساتھ کھانے لگا۔ کتوں سے معاش
چھچھڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش

پاکیزگی طبع و لطافت وہ بر طرف
کہا بغل میں مارے لگا پھرنے ہر طرف

دھکار و کتے کو تو لہو اپنا وہ پیئے
ہے اس کی استخواں شکنی کتوں کے لیئے

یا جھوٹے ہاتھ کتے کو مارا نہ تھا کبھی
یا کتوں سے چٹاتا ہے اب اپنے منھ کو بھی

کتے ہیں پاس کتے ہیں جیب و کنار میں
کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں

آیا جو ایک روز وہ بے تہ چلا ہوا
کتا ازار اس کی سے نکلا بندھا ہوا

پاس سگ گزیدہ کی سی طرح جھومنے لگا
پھر کھول اس کے منھ کے تئیں چومنے لگا

ایسی بھی ہم نے دیکھی نہیں کتوں کی ہوس
گردن میں اپنی ڈالے پھرے روز و شب جرس

ٹکڑا ہے جس کے ہاتھ میں یہ اس کا یار ہے
جیسے سگ سرائے سگ ہر سوار ہے

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا
دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

تھکتا ہے پھر جو کرتے ہوئے دوڑا دردھاڑ
لیتا ہے بے دماغ ہو لوگوں کے کپڑے پھاڑ

جو ہڈیوں پہ لڑتا رہا ہو بسانِ سگ
ہو آدمیت اس کو بھلا کس مقام تک

انساں کو اس کتے سے اتنا ہوا ہے کب
ناپاک اس کو جانتے ہیں پاکیزہ لوگ سب

اصحاب کہف کا بھی جو سگ ہو تو ہو وہ سگ
نجم الدین کے بھی کتے کو کتا کہے ہے جگ

کر سگ تخلص اپنا جو آیا بروئے کار
اکراہ سگ تو ندے کرنے لگا دیار

رہتے نہیں نفور تو سگبانِ بے شعور
کھاتے ہیں وہ بھی کہتے ہیں کتے کو دور دور

کیا جانیے کہ یہ گھہ سگ کیا متاع ہے
بازار میں جو دیکھے ہے سگ کو متاع ہے

[illegible] کتے کا گو کا

آدم گری اڑا رکھی۔ حرف وسخن گیا
دیکھا جو خوب تو سگِ دیوانہ بن گیا

دُم لا یہ[1] جو دیے۔ تو لگے کرنے بدخصال
دوڑے وگرنہ کاٹنے کو کُتّے کی مثال

کم بخت یک غریب جو مردہ سا پڑے یہ
مرگھٹ کے کُتّے کی طرح سے پھاڑ کھائے یہ

اور مدعی ہو تک بھی تو ہی دل قوی نصیب
پھر آگے اس کے سوکھی سی بلّی ہی یہ غریب

رہتا ہی سخت شیفتہ کتوں کے بال کا
پلّا یہ ہی کہے تو کسو کتّے وال کا

کتوں کی لیکے زرد وسیاہ وسفید چشم
کس کس طرح سے دیکھتا ہی داب اپنے اب چشم

کتوں کے شوق میں جو یہ آتش ہی زیر پا
کہتا ہی اس کو اب سگِ پا سوختہ بجا

اس کی پلیدی شہرۂ ہر شہر ہی رہی
کُتّے کے کاٹے کی سی اسے لہر ہی رہی

دلی میں تین کتیاں کہیں لیکے پالیاں
ہمسائیوں کی جھنوں کے لیئے کھائیں گالیاں

وے مرگئیں تو دیر رہا روتا غمزدہ
پشتی[2] کے پیچھے پھر نہ ہنسا تک ستمزدہ

موتی[3] کا گرم غم جو رہا سوکھ نخ ہوا
برفی[4] کی تعزیت میں سگِ روئے بخ ہوا

بلی جو پالتا تو بھلا ایک بات تھی
آئیں ہیں اس کی دوستی یاں کے ساتھ کتی

توراں کے لوگ ہو ویں کہ ہوں اہل اصفہاں
کُتّا تو کشتنی ہی سب اسلامیوں کے یاں

جس کو خدا خراب کرے پھر وہ کیا کرے
کیونکہ زبان نکالے نہ جوں سگ پھرا کرے

آواز دے دے کتوں کو توڑے ہی اپنی جان
مرجائے گا یہ بھونکتے ہی پھونکتے نداں

ہی بس کہ سگ پرست مرے گا جو یہ دنی
توشے میں اس کے ہوگا نہ کچھ غیر سگ کنی

کتوں کے پیچھے پھرتا ہی گلیوں میں ڈور ہو
یہ سب ہی اس لیئے کہ ہر اک جائے شور ہو

اس وضع ساختہ کے ہوں احمق فریفتہ
بہرہ ہی جن کو عقل سے وے کیوں ہو شیفتہ

ہی اس طرح کے معرکہ گیروں سے پُر جہاں
بہتیرے ایسے کتے نچاتے پھرے ہیں یاں

[1] دم ہلانا [2،3،4] کتیوں کے نام [5] وہ کتا جو برف پر پڑا ہو۔

بڑپیٹا

(۲۵)

ایک پر خور آشنا ہے پیر
سینہ سوراخ جس سے ہی کف گیر

صدمنی دیگ ہی شکم اس کا
نفس اژدہا ہی دم اس کا

آنت شیطان کی ہی اس کی آنت
دانت اس کا ہی ہاتھی کا سا دانت

خستۂ جوع وہ جو آئے نہار
مینھ ہی گویا کہ زخمِ دامن دار

شکل مت پوچھ کہانے کا ہی بلی[1]
منھ ہی چھیپٹوں[2] سے جیسے روٹی جلی

گال گلچے سے پھر توے سے سیاہ
کاسۂ سر ہی جیسے اوندھا کڑاہ[3]

توند کالی جو کھول جاوے لپیٹ
آہنیں ہی تنور اس کا پیٹ

راہ مطبخ میں پاوے ہی جو کبھی
چاٹ جاتا ہی دیگچے تک بھی

کھانا نکلے پر آوے ہی کیسے
چیل ٹوٹے ہی گوشت پر جیسے

وقت کھانے کے ہاتھ ہی اس کا
قاب پر نان پنجہ کش گویا

کیا وہ دوپیازہ کھاکے ہو تازہ
اک نوالا ہی مُلا دوپیازہ

گوشت ہانڈی بھرا ہی خنک[4] میں
ہنڈیاں گویا تھیں اُس کی خشتک[4] میں

خام طمعی سے اک کرے ہی آہ
دیکھ کر شب کو نانِ ہالہ ماہ

نہ ٹلے دیکھ کر وہ قاب پلاؤ
منھ منھ بیٹھا گرچہ کھاوے کھاؤ

کھانے پر جب وہ جی چلاتا ہی
لاٹھی پاٹھی بھی کھائے جاتا ہی

نہیں پہنچے جو کھانا کھانے لگ
ہڈیوں پر لڑے ہی جیسے سگ

بھوک کا باؤلا جو آتا ہی
لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہی

دَہُوں[5] میں دشمنوں سے بھی وہ لئیم
جائے گھل مل اگر سنے ہی حلیم

[1] مرد۔ بہادر [2] چھیپکے: اغوں سے [3] ٹھوڑی کے نیچے کا مقام ضرورتِ شعری سے ن کو مشدد کر لیا ہی [4] بیانی رومالی۔ [5] عشرۂ محرم میں دوسرے مذہب والوں

آسش بغرا[1] پہ مار بھی کھاوے / اس میں گو بوغرا[2] نکل جاوے
کسی مفلس کے گھر جو جاتا ہے / کچھ نہیں خفتیں ہی کھاتا ہے
بھوکھ سے جب کہ غصّے میں آوے / بزکوہی کی طرح جھنجلاوے
ٹڈیوں کو نکہہ[3] کے کھا جاوے / چنے لوہے کے بھی چبا جاوے
زہر کا جلنا آگ سے مانوں / بھوکھ اس کی جلے تو میں جانوں
نکلے بازار میں وہ جب چربوز / سر ہی پھوڑے ہے دیکھ کر تربوز
گھاس پات اور کانس کھاتا ہے / نیشکر پر وہ بانس کھاتا ہے
اوس کے آنے کی سن کے بازاری / کرتے ہیں سودوں کی خبرداری
کوئی تختہ کرے ہے دوکاں کو / کوئی لاوے بلا گز رباں کو
کنجڑے ڈھانکیں ہیں ساگ پات اپنا / تکے ہے بنیہ داؤ گھاستا اپنا
کہ مبادا ادھر کو آ جاوے / سووے یکسو ہمیں نہ کھا جاوے
اینٹ پتھر بھی کھا گزر جاوے / الغرض پیٹ اپنا بھر جاوے
پیٹ اپنا بڑا جو پاتا ہے / کوہ تک کا بھی حیف کھاتا ہے
وہ قضارا مرا ہوا مہمان / کھا گئی اس کی میزبانی جان
گھر میں جو کچھ تھا بیچ منگوایا / کھانا اس کے لیئے میں پکوایا
کتنا کھانا بیاں کروں تجھ سے / جس پہ سو مہماں کروں تجھ سے
مجھ سے تھی روزگار سے ان بن / خوب کھانا تو تجھ پہ ہے روشن
چار من گاجروں کا قلیہ تھا / وہ منی دیگ بیچ ولیا تھا
روٹیاں کس قدر بتاؤں میں / جس کو دو چار سال کھاؤں میں
چاہ کر کے گرا وہ بلاغ[3] / مادرِ روحِ اشعب[4] طماع
تھے ابھی روٹیوں کے جبیٹے جبیٹا / میں رہا کہتا کھا گیا وہ سمیٹ

[1] ایک کھانا جو چاولوں میں گوشت ڈالکر پکایا جاتا ہے، شہرا۔ [2] بلغم۔ [2] بھرکس۔ [3] ناخنوں سے چھیل کر بغیر چبائے نگل جانے والا۔

[4] ایک مشہور حریص جس کا داماد عباس اس سے بھی زیادہ حریص تھا۔

کھانا کوئی اور کیا کھیے اس کا — سارے منھ دیکھتے رہے اُس کا
جب مرے گا وہ بھوک کا روگی — روح توشے کی روٹی میں ہوگی
کھانے کی بو جو ناک میں پیٹھے — مرگیا ہووے تو بھی اُٹھ بیٹھے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں — وہ مرے بھوک اس کی مرتی نہیں
بھوکے اس کا جو جی نکل جاوے — گور میں بھی کفن نگل جاوے

مرغ بازی

(۲۶)

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے
گرم پرخاش مرغ یاں آئے

پر و پرزا درست و یکساں ہے
مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے

مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ
قاز و سارس سے جنگ جس کا ننگ

حوصلہ کس قدر ہو اصل کا
ذکر کیا کرگس ستردل کا

لات کی گھات کر جو مڑ جاوے
نسرِ طائر کا رنگ اڑ جاوے

لات مارے جو کاٹ کر حلقوم
حیدرآباد تک پڑی ہے دھوم

ٹینی کے سر پہ آج ٹیکا ہے
اس کے آگے کلنگ پھیکا ہے

کب ہیں پیلے سے مرغِ زریں بال
حسن لاکھے کا بچے مرغ خیال

کر سکے وصف مرغ کیا کوئی
مرغ آمین کو دعا گوئی

مرغ کا مرغ ہووے مرغ انداز
مرغ ایسا ہو تو بجا ہے ناز

یعنی اپنا حریف جب پاوے
پر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے

سینہ کیا سینہ بال کیا پر و بال
جیسے چشم خروس آنکھیں لال

اور جو سست ہو ہوا ڈھیلا
دونوں بازو کے پر دیئے پھیلا

دم سے کیا ہو یہ بیدم و مجروح
قصدِ پرواز میں تھا مرغِ روح

مرغِ قبلہ نما کو وحشت ہے
بال کھولے ہیں پر نہ طاقت ہے

ورنہ اڑ کر کہیں چلا جاتا
ورنہ اپنے مقام پر آتا

مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش
جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش

مرغ کی ایک پرفشانی ہے
ان کی صد رنگ بد زبانی ہے

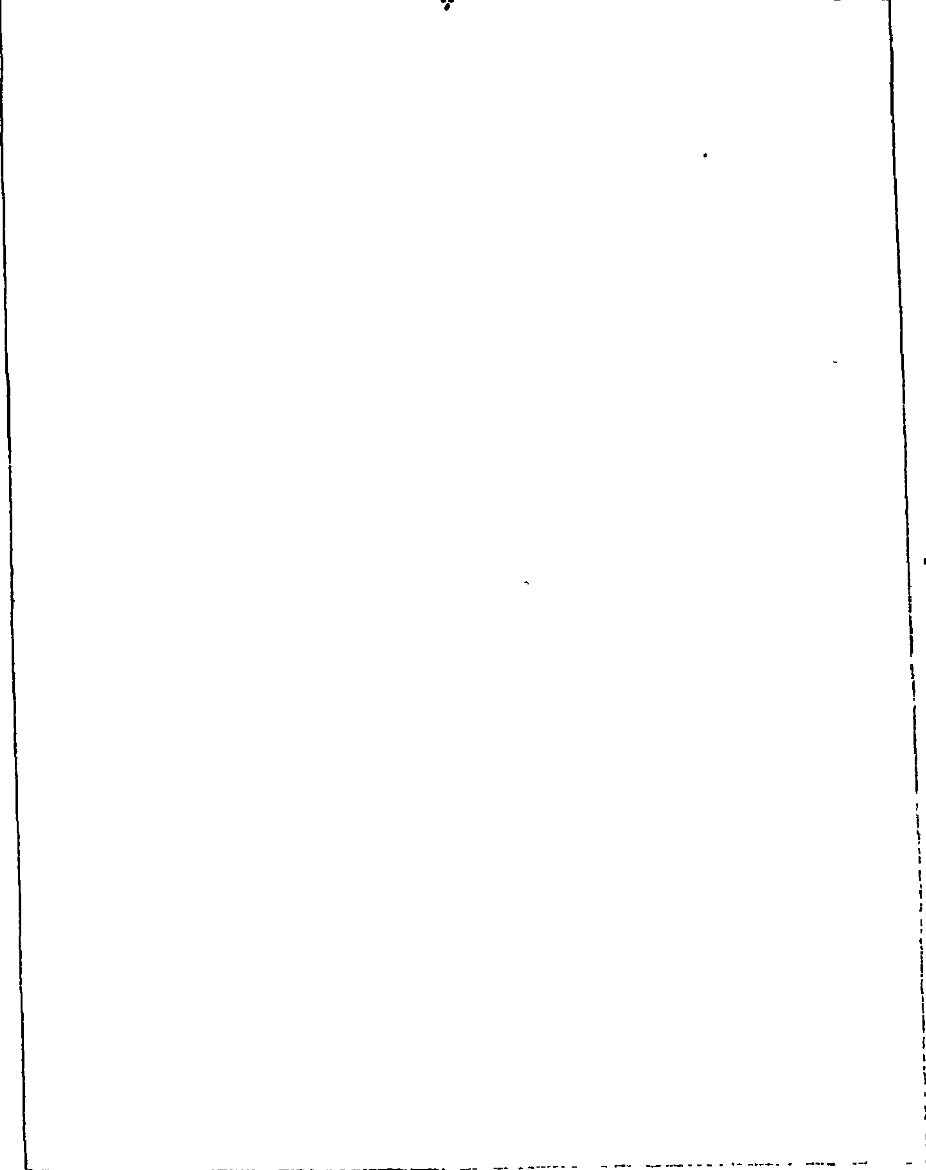
۱؎ ایک بڑا جانور ۲؎ ایک ستارہ جس کو عقاب بھی کہتے ہیں ۳؎ خاردار ۴؎ پینے مرغ جیسے ۵؎ ... ۶؎ فرشتہ اس کے لیے دعا مانگتا ہو ۷؎ کلغی

جھکتے ہیں آپ کو چراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہ بھی کھاتے ہیں

ایک کے منہ میں مرغ کی منقار — ایک کے لب پہ ناسزا گفتار

منہ میں آیا جو کچھ سو بکنے لگے — تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے

طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے — بعد نصف النہار رخصت ہے



غم نداری بز بخر

(۲۷)

کہتے ہیں جو "غم نداری بز بخر" — سو ہی لی ہیں ایک بکری ڈھونڈھ کر
شعر زورِ طبع سے کہتا ہوں چار — ورزی بر گیری نہیں اپنا شعار
ورزی ہی شائستہ خوں ریزی کا یاں — بلکہ بابت[1] ہی بر آویزی کا یاں
میں پڑھوں ہوں اس کے آگے شعر گہ — اپنے یاں گویا بز اخفش ہی یہ
بکروں کی داڑھی کٹی جاتی ہیں سب — تکہ ریشی[2] بکری کی ہی بوالعجب
رنگ سر سے پاؤں تک اس کے سیاہ — چکنے ایسے خستہ کم ٹھہرے نگاہ
اس پہ کالے بکرے دو خیلا جنے — ناز نخرے سے رہے پھرا سمٹنے[3]
چار ابیٹھے کھاتے ایک انداز سے — دیتے بٹھ تو ہوتے خوش اس ناز سے
گھاس دانا بارے کچھ کھانے لگے — گرتے پڑتے پاس بھی آنے لگے
پرورش سے حق کی بارے جی گئے — اب وہ دانہ دوڑ کر کھا پی گئے
اب جوانی پر جو ہیں وے شیر مست — کودتے ہیں ہر زماں ہر دم ہے جست
زور و قوت سے حریفوں کی ہیں ڈھینگ — آ ہوئے جنگی کو دکھلاتے ہیں سینگ
ٹکر ان کی کیا جگر مینڈھا اٹھائیے — فوج[4] سر زن سامنے ہرگز نہ آئیے

[1] لایق۔

[2] کچی داڑھی ہونا۔

[3] بحال۔ خوش۔

[4] ٹکر سے لڑنے والے جانوروں کی فوج

بوزنہ

(۲۸)

بوزنہ یا کوئی تحفہ دہر کا
عزت افزا ئندہ تھا اس شہر کا

ربط اسے جس سے ہے اس سے ربط ہے
مار کھانے پر بھی اس کو ضبط ہے

لیکن اس جاگہ تو صادق ہے یہ قول
سارے اس کے آدمی کے سے ہیں ڈول

ہے تماشا آئنہ کے روبرو
عکس سے اپنے اسے ہے گفتگو

دیکھنا جھک جھک کے اس کا ہو نہ ضبط
آرسی بندر کا ہے مشہور ربط

جان دیں بندر اگر دیکھیں چنے
رہتے ہیں چاول پڑے اس کے کنے

موہنی بلّی

۲۹

ایک بلّی موہنی تھا اس کا نام — اُن نے میرے گھر کیا آکر مقام
ایک دو سے ہو گئی اُلفت گزیں — کم بہت جانے لگی اُٹھ کر کہیں
ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ — دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ
حاملہ ہو کر کئی بچّے دیئے — ایک دو بھی سو نہ اُن میں سے جیئے
متصل ایسا ہوا جو اتفاق — مرگ ان بچّوں کی گزری سخت شاق
حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہوا — جھاڑے پھونکے کا ہر اک عازم ہوا
پانچ بچے ان نے اس نوبت دیئے — بارے سب وے قدرتِ حق سے جیئے
اپنی ماں کے رات دن سینے لگے — پانچوں بچّے دودھ کچھ پینے لگے
کوئی کُتّا آگیا ایدھر اگر — لوگ دوڑے شیر سے منہ پھاڑ کر
ڈر سے بغلیں[1] سب ہوئیں یاروں کی گم — زرد زرد اُن کی دُمیں منہ نرم نرم
پچھے ریشم کے سے چندیں رنگ خال — کچھ سفید و کچھ سیہ کچھ زرد و لال
نکلتی تھیں جدھر یہ پانچ چار — وہ طرف ہو جاتی تھی باغ و بہار
ایک عالم عاشق و بیتاب تھا — ان کی خاطر بے خور و بے خواب تھا
گرد رو[2] باندھو تو چہرہ حور کا — چاندنی میں ہو تو بکا نور کا
گرم شوخی ہو اگر یہ مثلِ برق — بجلی میں اس میں نہ کچھ کر سکیئے فرق
یا پری اس پردہ میں ہے جلوہ گر — اُٹھتی اودھر سے نہیں ہرگز نظر
داغ گلزاری سے اس کی تازہ باغ — اس زمانِ تیرہ کی چشم و چراغ
کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفیس — کیا مصاحب بے بدل کیسے جلیس
یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز — آنکھ[3] دوری بھی نہ ہو کیسی ہے چیز

۱ خوف سے بغلوں میں لے لیا ۲ گول چہرہ ۳ چہرے سے دور رکھنا تو در کنار آنکھ سے دور رکھنے کو جی نہ چاہے۔

کتیا اور بلاؤ کی دوستی

(۳۰)

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں
دو ہیں قالب اور ان کی اک ہی جاں

رنگ گربہ سے شیر نر ہے داغ
آنکھیں اس کی اندھیرے گھر کا چراغ

کھائے نہ جو نہ ہو وہ مادۂ سگ
بھوکا بیٹھا رہے قیامت لگ

کب مروت سے جائے کھانا چکھ
لڑتے ہیں بھی تو پنجہ منھ پر رکھ

سارے ہمسایوں پر ہے یہ معلوم
موش کی نسل ہو گئی معدوم

چوہا کیا ہے جو سامنے آوے
گھونسوں سے بھی یہ شیر بھڑ جاوے

ان نے جو ماریاں ہیں گھونسیں و موش
موشِ دشتی ہوا ہے کونے گھونس

گھونس جب فکر ہی میں مرتی ہو
موشِ دشتی پہ کیا گزرتی ہو

کوئی چھچھوندر جو بستی میں یاں ہے
سو وہ چوہوں کی مرثیہ خواں ہے

ایک دن گھر میں ایک گھونس آئی
اپنے پاؤں اجل اسے لائی

گھونس کیسی بتاؤں غیرتِ موش
طاق ہے جس کے آگے طاقتِ سوس

یا کوئی مادہ خوک آبستن
یا کسو کچھوے کی برادر زن

پھرتی پھرتی جو صحن میں خوشحال
پائے دیوار بیٹھی سر کو نکال

کہیں ادھر یہ شیر جاتا تھا
پھیرتا منھ پہ پنجے آتا تھا

پڑ گئی اس کی اس پہ چشم کبود
نیلا پیلا ہوتا دکھا جوں دود

پنجہ جھنجلا کے ان نے گزرانا
بارے کچھ گھونس نے اسے جانا

پر اسے خوف جاں نہ آیا کچھ
غالب آیا نہ اس کا سایا کچھ

ٹھٹکا یا پھر ان نے جاتا لو
کیونکہ تھا یہ تو شیر کا خالو

۱؎ دراز دنبالہ ـ لمبی دُم

۲؎ ایک قسم کا مگرمچھ جسے خوکِ آبی کہتے ہیں۔

پھر تو بگڑی ہی دونوں میں آکر — چوٹ ہوئی ہی داؤ پا پا کر
غصّہ خرگوش کو بھی آن چڑھا — اتفاق اُس جگہ تھا ایک گڑھا
دونوں لڑتے ہوئے گرے اس میں — کیچ کو گاہتے پھرے اس میں
ناخن اس شیر کا کچھ ایک گڑا — شورِ محشر گڑھے کے بیچ پڑا
شور کیسا محلے چونک اُٹھے — سگ بازاری بھونک بھونک اُٹھے
یاں تو گھر بیچ کیا ہی کیا ہی پڑی — گھونس بلّی نے چھیچڑے کر دی
کھڑی مونچھوں کے بال اکڑاتا — شیر نکلا گڑھے سے گھبراتا
لیک جی سے تھا سب بدن خالی — کیونکے سر سے بلا بڑی ٹالی
گھونس کے وارثوں کی کیا ہی تاب — کہ قدم کو رکھیں وہ حتّی الباب[۱]
کوئی چھچھوندر اب اس پہ روتی ہی — کہ تری لاش خوار ہوتی ہی
تو جو تھی ساری قوم کی سردار — سو اُٹھایا ہی زخمِ دامن دار
ہم بہت غم میں تیرے رووینگے — بِل کے بِل اب خراب ہووینگے
فخر ہی اپنی نسل کا یہ شیر — جن نے گھونسوں کے کر دکھائے ڈھیر
سُنا ہی موش گربہ کا قصّہ — وہ جو ہی گا عبید کا حصّہ
جس کو باندھا عبید زاکانی — لگتی تھی اس کی وہ سگی نانی

قطعہ

گربہ تا بود فاسق و فاجر — صید او یک بُدے بسالانہ
این زماں پنج پنج مے گیرد — کہ شدہ مومن و مسلمانا

[۱] دروازے تک۔

مادہ سگ

(۳۱)

ہی جو وہ مادہ سگ تماشا ہی
کسی کے لقمے پر نہ مُنہ ڈالا
نہیں کتیوں سی خوارِ یاں کی یہ
دے ہرن کو بھی جلدی میں بتا
اُڑتی چڑیا انھیں نے ماری ہی
یہ جو غصے میں آوے تو ہی غضب
منھ میں دیتے ہیں اس کے جب مشعل
منھ میں اپنے لیے فتیلے سے
باہم اس بلی کتے کا یہ ربط
کبھو جاتا جو ہی یہ کوٹھے پر
اور رسے دشمنی جانی ہی

دوڑ پڑنے کے وقت باشا ہی
سگِ اصحابِ کہف کی خالا
ہی سگوں میں عزیز خاں کی یہ
ہی گا یاں سگ لونڈ کہا کتا
استخوانِ سگِ شکاری ہی
اس کے مارے ہوے ہیں ہائے سب
طرفہ دُم لابہ کرتی ہی اچپل
سگ لیلیٰ کے ہی قبیلے سے
کوئی دیکھے نہ ہووے اس سے ضبط
لگی رہتی ہی اس کی چھت سے نظر
اس کی یہ باولی دوانی ہی

۱؎ ایک شکاری پرند

۲؎ بدمعاش

۳؎ دُم ہلانا

خروس

کئی برس سے ہمالے کے تھا ایک خروس
خروس عرش کی اولاد سے ولے افسوس

پھرا جو اُس سے یکایک زمانۂ کج باز
قضا نے اس کو کیا ایک بار مرغ انداز

دیا کرے وہ اذاں دونوں وقت صبح و شام
بجا ہے مرغِ مصلیٰ رکھیں گر اس کا نام

نہیں ہے مرغ چمن میں جہاں کے ایسا آج
برنگِ کُلّہ تاجِ خروس سر پہ تاج

جو بیٹھے جھانپے میں پرداز[51] پر سے مرغِ خیال
کھڑا ہو دھوپ میں تو رشکِ مرغِ زریں بال

کبھو جو صحن میں گھر کے وہ اشرف الطیار
پھرا ہے کیس کو ڈالے تو مرغِ آتش خوار

نہ پیچ[52] خم ہیں ثناگستری میں اس کی مدام
بزرگداشت کریں مرغ سبزوار تمام

رہا ہمیشہ سے وہ مرغ مستعدِ جنگ
طرف نہ اس کے ہوئے بچ گئے ہیں قاز و کلنگ

جب اُن نے گانٹھ کے اک لات حلق پر ماری
شتر دلی کی شتر مرغ نے کئی باری

نہ اس کے سامنے کوئی کھڑا رہا مرغا
حواصل[53] اس سے بگڑتا تو تھا وہ کیا مرغا

بجز کنارہ نہ سیمرغ کو بنا چارہ
کہ فیل مرغ کو بکری کی طرح سے مارا

ہمیشہ گربہ و سگ سے بھی روک ٹوک اسے
جہاں سے لے گئی آخر یہ نوک جھوک اسے

خصومت اس کی بھی یک مادہ سگ سے شام و سحر
کبھو وہ لات اُسے مارتا کبھو شہپر

قضا جو پہنچی تھی نزدیک وہ بھی جھنجلائی
حریف ہو کے دلیرانہ سامنے آئی

یہ بہتہیا[54] تھا نہ سمجھا ادا کو سیکنے کی
لگائی سامنے ہوتے ہی ایک سینے کی

ہلائی اُن نے بھی گردن لگی کہیں بے کل
کہ ایک دم میں گئی آہ گردن اُس کی ڈھل

جھکا جو خاک کی جانب تو کیس بے جاں کا
زمیں پہ تاج گرا ہدہدِ سلیمان کا

ہو لکے مرغ ہوئے داغ اُس کے ماتم سے
سیاہ پوش رہے طایرِ حرم غم سے

۵۱ ساخت کی موزونی ۵۲ پیچ ۵۳ ایک آبی پرند ۵۴ خودرائے، بیوقوف

وہاں جو نوحۂ مرغانِ قدس پانہ ہوا	کہ مرغِ قبلہ نما کا بھی دل گداز ہوا
قفس کے مرغ نے سن ترک آب و دانہ کیا	طیور نے بھی نہ پھر قصدِ آشیانہ کیا
ہوا ز بس کہ پراگندہ یہ غمِ جاں سوز	اُداس رہنے لگے سارے مرغِ دست آموز
خروس عرش ہی اس بن نہیں ہے سینہ فگار	ہزار[1] مرغ کا اب گھر خروس پر ہے بار
زمانہ جب تئیں ہے اس کے درد کے مارے	رہیں گے خاک فشاں مرغِ خانگی سارے

خموش میر تجھی کو نہیں یہ رنج و تعب
کباب آتشِ غم میں ہیں مرغ و ماہی سب

تمام شد



[1] بلبل ہزار داستان کا ہونا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔